کھوکھلی گگر

احمد رشید (علیگ)

کھوکھلی گگر

احمد رشید (علیگ)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"

KHOKHLI KAGAR

by

Ahmad Rasheed (Alig)

Gali Rehat Wala Kuan,Sarai Rehman,
Aligarh (U.P) -202001
Mob.: 7906320541
ahmadrashrrd723@gmail.com

Year of Edition 2019
ISBN 978-93-89002-00 -3

₹ 125/-

نام کتاب	:	کھوکھلی کگر
مصنف وناشر	:	احمد رشید (علیگ)
سنہ طباعت	:	۲۰۱۹ء
قیمت	:	۱۲۵ روپے
تعداد	:	۵۰۰
صفحات	:	۱۹۷
کمپوزنگ	:	دانش ایاز، رانچی +91-7903484544
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر مولا بخش

کے نام

زمانہ سخت کم آزار ہے، بہ جان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

مرزا غالب

فہرست

○	نئی علامت نگاری اور احمد رشید کے افسانے محمد غالب نشتر	07
○	ابتدا کی طرف واپسی	35
○	بھورے سید کا بھوت	49
○	دوسال بعد	60
○	ویٹنگ روم	70
○	بجوٹ	78
○	مداری	88
○	بن باس کے بعد	95
○	وہ اور پرندہ	105
○	کھوکھلی کگر	142
○	حصار	155
○	پیشن گوئی	163
○	صدیوں پر پھیلی کہانی	172
○	بائیں پہلو کی پسلی	178
○	مشاہیر کی آرا	193

○○○

نئی علامت نگاری اور احمد رشید کے افسانے

محمد غالب نشتر

مابعد جدید رجحان نے جہاں ایک جانب اردو کے تمام اصناف کو متاثر کیا، وہیں اردو افسانہ بھی اس کے زد سے نہ بچ سکا بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اصنافِ شعر میں نظم اور اصنافِ نثر میں افسانہ، اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جن میں جدیدیت نے اپنا نقش ثبت کیا اور مابعد جدیدیت نے بھی انہی اصناف کو نشان زد کیا۔ جس طرح سے جدیدیت کو ترقی پسند تحریک کی ضد کہہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی، ٹھیک اسی طرح مابعد جدیدیت کو جدیدیت کے روبرو رکھ سکتے ہیں۔ جدید دور کے جو امتیازات فن پاروں پر اثر انداز ہوئے تھے، انہی خیالات کو ردّ و بدل کے ساتھ مابعد جدید فن کاروں اور ناقدین نے روا رکھا مثلاً علامت کا عنصر جدید دور کا نشانِ امتیاز تھا تو نئی تخلیقات میں بھی علامت کو برتا گیا لیکن ہلکی سی ترمیم کے ساتھ۔ دوسرے خصائص کا بھی اسی طور پر اطلاق کر سکتے ہیں۔ مابعد جدید دور میں دو طرح کے افسانہ نگار ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔ پہلی نسل کے وہ افسانہ نگار ہیں جو ایک زمانے سے افسانے لکھ رہے تھے اور دبیز علامات برتتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اہمال اور اشکال سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے نئی علامات وضع کیں اور قاری کا خاص خیال رکھا۔ دوسری نسل کے افسانہ نگاروں کے سامنے ایک واضح تصور سامنے آچکا تھا لہٰذا انھیں ذہنی کشمکش سے نہیں گزرنا پڑا۔ ان کے سامنے دبیز علامات کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اسی لیے بعد کے افسانہ نگاروں نے فرسودہ علامات کو ترک کر کے نئی علامات کے رجحان کو عام کیا۔

انہی افسانہ نگاروں کی فہرست میں احمد رشید (علیگ) کا بھی شمار ہوتا ہے۔ احمد رشید کی کہانیاں اِدھر چند متعدد رسائل میں یکے بعد دیگرے پڑھنے کو ملیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کی کہانیوں سے حصار سے نکلا ہی تھا کہ ''بائیں پہلو کی پسلی'' نے آدبوچا۔ یہ افسانہ نگار کا دوسرا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ واضح رہے کہ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''وہ اور پرندہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں اشاعت سے ہمکنار ہو کر ادبی دنیا میں داد تحسین وصول کر چکا تھا۔ عام خیال ہے کہ احمد رشید کے قارئین کا حلقہ وسیع تو ہے لیکن ان کے افسانوی فن پر لوگوں نے بہت کم توجہ دی ہے یا کم کم ہی خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ احمد رشید کے افسانوں کے علائم و استعارات کی تفہیم کے لیے جس بارک بینی، وسیع القلبی اور مطالعۂ کائنات کی ضرورت ہے، اس سے آج کا قاری تقریباً عاری ہے۔ احمد رشید نے بلا ضرورت یا علمیت بگھارنے کے لیے علائم کا استعمال نہیں کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے اندھیرے میں استعارات کی تیر چلائی ہے بلکہ مناسب و موزوں علائم کا استعمال کر کے فن پارے کو تہہ دار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کی نظر دونوں مجموعوں کے افسانوں پر جاتی ہے تو علائم کی گرہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور تھوڑی بہت کامیابی ہاتھ لگتی ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ اسی خوش فہمی کو ظاہر کرنے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے تاکہ ان کے علامتی افسانوں کی حتیٰ المقدور تفہیم ممکن ہو سکے۔ اس مضمون کا باقاعدہ آغاز سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر شافع قدوائی کے مضمون ''احمد رشید کے افسانے'' سے ایک اقتباس نقل کیا جائے۔ ان کے خیال میں:

> ''زندگی کے مختلف مظاہر، اس کی رنگا رنگی، بوقلمونی اور ارتقا و افزونی کے مختلف مراحل کو تخلیق کائنات کے قدیم آرکی ٹائپ سے مربوط کرنا اور تخلیق کے ازلی متھ کی معنویت عصری تناظر میں واضح کرنا ایک تازہ کار افسانہ نگار احمد رشید کے جن بعض افسانے بر

صغیر کے مقتدر جرائد مثلاً ''جواز''، ''شاعر'' اور ''آہنگ'' میں شائع
ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں، فن کار کا بنیادی رمز ہے۔''

احمد رشید کے دونوں افسانوی مجموعوں کو مدنظر رکھا جائے تو کئی کہانیاں ایسی مل جائیں گی جن میں علامت کا بہترین استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے ان کے پہلے مجموعے کی کہانیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس ضمن کی پہلی کہانی ''کہانی کہتی ہے'' اس لیے اہم ہے کہ اِس کہانی میں بہ ظاہر کہانی کے ارتقائی سفر کو بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی یہ کہانی انسان کے تمدنی و تہذیبی سفر کی جانب بھی نشاندہی کرتی ہے۔ کہانی کا بہ تدریجی سفر اور انسان کے معاشرتی عمل کو فنکارانہ چابک دستی سے ایک ساتھ پرونا کہ کہانی پن شروع سے آخر تک برقرار رہے، یہ خود افسانہ نگار کا کمال ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ لفظوں سے کھیلنا اور نئی علامات تراشنا احمد رشید کا پسندیدہ عمل ہے۔ وہ عام سی بات کو علامت کے پیرائے میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ قاری بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے مجموعے کی پہلی کہانی ''کہانی کہتی ہے'' کو لیں۔ اس کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ''اس نے سمندر میں جھانکا، وہ کنارے پر مجسمہ بن گئی۔ سوچتی ہے کہ سمندر کے شفاف اور گہرے پانی میں سورج طلوع سے غروب تک ڈوبا رہتا ہے۔'' اس جملے میں ''سمندر'' ماضی کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور ''پانی'' وقت کی علامت کے طور پر۔ سمندر کا کنارا ''زمانۂ حال'' کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ''ماضی'' کی طرف پلٹنا اور حیرت و استعجاب کا مجسمہ بن جانا ایک فطری انسانی عمل ہے۔ صدیوں پر پھیلے انسان کے تہذیبی سفر اور خود انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ''کہانی'' کا وجود ہو چکا تھا۔ صدیوں پر مشتمل کہانی کے ارتقائی سفیر کا طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک افسانہ کا اختتام پر پہنچنا اس طرح معنی خیز بن جاتا ہے کہ تخلیقِ کائنات ہو یا تخلیقِ انسان، دونوں سورج کے طلوع ہونے کی علامت ہیں اور غروبِ آفتاب، انسان اور کائنات کے فنا ہونے کی جانب اشارہ ہے۔ کیوں کہ اسلامی فلسفہ کے

مطابق قیامت کے آنے کا وقت ''رات'' ہی کو بتایا گیا ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ گہرے پانی میں سورج کا ڈوبنا انسانی غرور کی نفی بھی کرتا ہے۔ ساتھ ہی سمندر میں ''کہانی'' کا وجود نظر آنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ افسانے سے کہانی کے جوہر کا ختم ہونا اور اینٹی کیرکٹر ہونا بھلے ہی نیک فال نہیں لیکن یہ سمجھنا کہ ''کہانی'' ختم ہوگئی، غلط ہے۔ ادھر انسان جس کی جبلت میں حیوانیت داخل ہونے کے باوجود وہ انسانیت کے اعلا مقام سے گر ضرور جاتا ہے لیکن گناہ ارتقائے انسانی کا لازمی عنصر ہے، اس لیے اس کا گرنا اور سنبھلنا اس کے متحرک اور زندہ ہونے کی علامت بھی ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ بالکل اسی طرح افسانہ کا کہانی کے جوہر کی طرف مراجعت اُس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ چوں کہ ادب کے اندر ٹھہراؤ پیدا ہونا یا اس پر جمود طاری ہونا، ادب کی بقا اور زندگی کے لیے سوالیہ نشان ہے۔ صنفِ افسانہ ہو یا دوسری ادبی اصناف، ان میں تجربات ہوتے رہنا ادب کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اس کہانی کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ صنف افسانہ کے عناصر ترکیبی کو اس طرح پرویا گیا ہے کہ کہانی پڑھنے کا تجسس شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے اور خود کسی نہ کسی انداز میں افسانہ کے اجزائے ترکیبی ساتھ ہی انسانی تہذیب کے ضروری عناصر اور اس کے ارتقائی سفر کا یہ افسانہ بہت ہی خوبصورت اظہار بن گیا ہے۔

اردو افسانہ کے ارتقائی سفر میں کارل مارکس کے فلسفہ کو احمد رشید نے سر کے بال سے شروع ہوکر ناف تک کے سفر اور فرائڈ کے فلسفہ کو ''کہ ناف سے پیر کے ناخن تک ایک پناہ گاہ ہے'' کہا ہے اور کہانی کا وہ زمانہ جب افسانے سے کہانی کا عنصر غائب ہوگیا تھا اور کہانی بے کردار ہوگئی تھی ''کہانی کہتی ہے'' کا نقطۂ آغاز ہے۔ کہانی کا باقی سفر فلیش بیک میں چلا گیا ہے۔ اس طرح افسانہ نگار کے بیان میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کر کے کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ افسانہ کا انجام خوش آئند ہے۔ افسانہ نگار کہانی کی بدحالی پر مایوس نہیں ہے بلکہ پُر امید ہے کہ افسانہ کہانی پن کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہاں یہ امر بھی

وضاحت طلب ہے کہ اس جدید دور میں انسان ترقی کے سرپٹ دوڑ میں کتنا ہی آگے نکل گیا ہو مگر اس کے تہذیبی انحطاط کا دور اس دائروی سفر میں اپنے بے شعوری کی طرف لوٹ رہا ہے جہاں آغاز وانتہا گم ہو گئے ہیں، انسانی رشتے ٹوٹ گئے ہیں اور قیامت خیز منظر ہے جس کو افسانہ نگار سے بیان کیا ہے۔

دوسرے مجموعے کی پہلی کہانی ''کہانی بن گئی'' بھی اسی نوعیت کی کہانی ہے جس کا بنیادی موضوع افسانے کا فن ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا ہر عمل اصل میں رد عمل ہوتا ہے اور رد عمل کی بنیاد کا کوئی نہ کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ احمد رشید اس کہانی کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کہانی اگر انسان کی حرکات وسکنات پر لکھی جائے گی تو وہ کہانی نہیں بن پائے گی لہٰذا کہانی کو بیان کرتے وقت منظر کے ساتھ، پس منظر کو بھی بیان کیا جاتا ہے تا کہ حقیقی صورت حال کی عکاسی ہو سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افسانے میں کہانی کے جوہر کا ہونا نہایت ضروری ہے کیوں کہ وہی اصل روح ہے اور اسے بامعنی بنانے کے لیے ''بیانیہ'' کا بھی عمل دخل ضروری ہے۔ اسی لیے کہانیوں میں جملوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہوتی ہے کہ اس کے اندر تہہ داری پیدا ہو جائے۔ ''کہانی بن گئی'' کی تکنیک کی سطح پر بحث کی جائے تو انٹرویو کے طرز پر لکھی گئی یہ کہانی ہے۔ ایک عورت جس نے آئینہ دیکھنا اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ سچ بولتا ہے اور عورت خوش شکل نہیں ہے لہٰذا وہ اس سفا کی کو قبول نہیں کرتی۔ عورت کے خمیر میں نرگسیت اور جمالیاتی حس زیادہ ہوتی ہے، اگر اُسے احساس ہو جائے کہ وہ بدصورت ہے یا کوئی راہ چلتا مسافر غیر شعوری طور پر کسی عورت کے سامنے تھوک دے تو اس عورت کے اندر شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس راہ گیر نے اسی کو نیچا دکھانے کے لیے ایسا کام انجام دیا ہے۔ ایسی صورت میں وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے گی۔ اسی احساس کمتری کا ازالہ کرنے کے لیے اس کہانی کی عورت، مرد کے فرضی نام سے کہانیاں لکھنا شروع کرتی ہے۔ اپنا قلمی نام روی کمار رکھتی ہے اور ملک کے مشہور افسانہ نگار

کا انٹرویو کرنے جاتی ہے۔کہانی میں اسٹیشن، سفر کی روداد، منظر نگاری پس منظر میں بیان ہوتے چلے جاتے ہیں۔افسانے کے کلائمکس پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ 'روی کمار' مرد ناول نگار نہیں بلکہ کوئی عورت ہے جو مرد بن کر کہانیاں لکھ رہی ہے لیکن مرد افسانہ نگار پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ وہی افسانہ نگار ہے۔ یہاں عورت کا احساس کام کرتا ہے اور وہ یہ سوچ کر خوش ہوتی ہے کہ کوئی تو ہے جو اُس کی خوبصورتی کا قائل ہے لیکن اُسے یہ احساس نہیں ہے کہ وہ مرد عمر کے ایسے مرحلے میں ملا ہے جہاں وہ فطری طور پر مرد ہے نہ عورت۔ یہیں پر کہانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔افسانہ نگار نے اس صورت حال کو نہایت خوبی سے برتا ہے اور عورت کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔

احمد رشید نے مختصر کہانیاں رقم کی ہیں لیکن چند کہانیاں طویل بھی لکھی ہیں جن میں ''وہ اور پرندہ'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔افسانہ ''وہ اور پرندہ'' تخلیق کائنات اور تخلیق انسان سے متعلق اساطیری اور مذہبی کرداروں کی معنویت کو عصری تناظر میں واضح کرتے ہوئے کہانی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

> ''یہ کہانی ''وہ'' کی ہے۔ ''وہ'' کی تخلیق ایک قطرے میں پوشیدہ تھی۔ جس نے قطرے سے سمندر تک کے سفر میں نہ جانے کتنے سورجوں کو چڑھتے دیکھا اور پھر اُن کو اُترتے دیکھا۔ یہ سفر جو یگوں پر مشتمل ہے، آج بھی جاری ہے۔اس سورج کو پانے کی جستجو میں جو اس تنگ و تاریک مقام سے شروع ہوا تھا، جہاں اس کی خوراک گندہ خون تھی اور برہنگی اس کا لباس.....۔''

حضرت آدمؑ کی پسلی سے حوّا کی تخلیق کے بعد انسانیت اور کائنات کا یہ سلسلہ آگے بڑھا۔تہذیب و تمدن کا یہ ارتقائی سفر بہ تدریج جاری ہے۔ ''وہ'' کی تخلیق قطرے سے سمندر تک سفر میں اس نے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ دیکھی اور انسان کے رحم مادر

سے ولادت کے عمل تک کی داستان کا ذکر کرتے ہوئے تہذیبی ارتقا کی طرف رمز ہے۔ساتھ ہی تہذیبی ارتقادائروی شکل میں اس طرح کہ انسان کا یہ سفر جو بے لباسی اور بے شعوری سے شروع ہوا تھا جو اَب اپنی ابتدا کی جانب لوٹ رہا ہے اور اس بے منزل سفر کو اندھے سفر کا استعارہ کہا ہے۔ یہاں بھی دیگر کہانیوں جیسے ''کہانی کہتی ہے''، ''صدیوں پر پھیلی کہانی'' کی طرح سمندر وقت کی علامت ہے۔کہانی کا متذکرہ اقتباس ایجاز واختصار کی بہترین مثال ہے۔تمام یگوں کی تاریخ اس میں سمٹ گئی ہے۔حیات وکائنات کے وسیع وعریض حدود اربعہ میں ''وہ'' زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے تھک گیا ہے۔جس طرح سورج پورے آب وتاب کے ساتھ دن کی مسافت طے کر کے تھکا ماندہ پرند کی مانند اپنے پر سمیٹ لیتا ہے۔ سورج وقت کا پیمانہ ، روز و شب ،عمر کا حساب و کتاب ، سمندر وقت کی علامت ___ ان سب ہی علائم کا بامعنی امتزاج افسانہ کو گہرائی اور گیرائی بخشتا ہے۔اس کہانی کی علامتیں ''سورج''، ''پرند''، ''ست رنگی'' اور ''یک رنگی'' ایک دوسرے میں اس طرح مدغم گئی ہیں کہ معنی خیزی میں شعریت کی کیفیت تخلیق ہوگئی ہے۔ایسی مثالیں افسانہ کی تمہید سے ہی نظر آتی ہیں۔جیسے ''ابھی بے لباسی، بے شعوری سے اس کا رشتہ نہیں ٹوٹا ہے بلکہ دائروں کی طرح یہ سفر، مسلسل سفر، قطرے سے سمندر کا سفر، بے کراں لہروں کا سفر، بے پایاں طوفانوں کا سفر، یگوں کا سفر، قرنوں کا سفر، ابھی مسلسل جاری ہے۔

انسان کا بہ وقتِ ولادت بے لباس اور بے شعور ہونا انسان کے تہذیبی ارتقا کی بنیاد، بے لباسی اور بے شعوری اور آج کے جدید دور میں انسان کا جسمانی اور تہذیبی طور پر ننگا ہونا، اس کا اخلاقی اور معاشرتی اعتبار سے زوال پذیر ہونا، وقت کے سمندر میں دائروی صورت اختیار کرنے کی علامت ہے۔ یہ انسانی تہذیب کا اندھا سفر مسلسل جاری ہے ___ ''وہ'' یعنی انسان کی زندگی ایک قطرہ میں پوشیدہ ہے۔اسے سمندر ہونے تک ایک عمر درکار ہوتی ہے۔انسانی کی تہذیب کا عہد طفل سے پیران سال تک یگوں اور قرنوں کا سفر جھیلنا

پڑا۔ جس میں اس نے نہ جانے کتنے طوفانوں اور پریشانیوں کو برداشت کیا۔ رنگ بدلتے اس آسمان کے نیچے اس کا اندھا سفر اب بھی جاری ہے۔ آسمان کا رنگ بدلنا، ستاروں کا گردش میں آنا، خود تقدیر کے خوش رنگ اور بدرنگ ہونے کا استعارہ ہے۔ انسان کے اس تہذیبی سفر سے گریز کرتے ہوئے افسانہ نگار نے کردار کے ظاہری عوامل سے اس چلنے کو جوڑ دیا ہے ___ ''وہ چل رہا.....'' یہیں سے افسانہ کا بنیادی کردار فلمی اسکرین کے فارم پر متحرک اور فعال نظر آنے لگتا ہے۔

کہانی کا عنوان ''وہ اور پرندہ'' ایک بامعنی عنوان ہے۔ ''وہ'' اور ''پرندہ'' دراصل ایک ہی کردار ہے۔ وہ کی تکمیل پرندہ کے بغیر نامکمل ہے۔ پرندہ انسان کے ضمیر اور اس کے نفس کا موتیف ہے جو انسان کی رہ نمائی بھی کرتا ہے اور اس کو برائی کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ پرندہ آزادی کا Symbol بھی ہے۔ کہانی تکنیکی سطح سے بھی عجیب وغریب ہے۔ اردو افسانہ کی تاریخ میں پہلی بار یہ تکنیک متعارف ہوئی، جو مصنف نے اختیار کی ہے۔ مذکورہ کہانی میں زماں ومکاں کی قیود ٹوٹ گئی ہیں۔ جس طرح ''شعور کی رو'' میں وقت کی تقسیم اور حدود بکھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک نئی تکنیک کے حوالے سے کہانی کہنے کا یہ انداز نرالا اور انوکھا ہے۔ اردو ادب میں ایسی کہانیاں بہت کم لکھی گئی ہیں جو کردار کے مختلف پہلوؤں کو ایک ساتھ مجموعی طور پر اُجاگر کرے۔ فنِ افسانہ میں اس کی گنجائش بھی کم ہے، حیات وکائنات اور زماں ومکاں کے متعدد گوشوں کو پیش کرنے کے لیے ناول درکار ہے۔ عام طور پر زندگی کے کسی ایک پہلو یا ایک احساس کو موضوع بنا کر افسانہ تخلیق ہوتا ہے اور افسانہ نگار کو کردار کے اسی پہلو کو پیش کرنے میں ہمدردی اور دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر وہی جذبہ یا احساس افسانہ کے دوسرے کردار میں بھی موجود ہو تو اُسے قطعاً ہمدردی نہیں ہوتی۔ اس کے جذباتی پہلوؤں کو نظر انداز کرنا افسانہ کے فن کا تقاضا بھی ہے لیکن ''وہ اور پرندہ'' میں افسانہ کے کردار کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے اس انوکھی تکنیک کا

استعمال آخر تک کامیابی سے برتا گیا ہے کہ افسانہ نگار کے کمالِ فن کی داد دینی پڑتی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ کہانی اس قدر چست اور مکمل ہے کہ افسانہ نگار نے دوسری کوئی کہانی نہ لکھی ہوتی تو افسانہ نگار کو زندہ رکھنے کے لیے یہ کہانی کافی تھی۔

جیسا کہ مذکور ہوا کہ ''پرندہ'' آزادی کی علامت بھی ہے۔ افسانہ میں بنیادی کردار مذہبی پابندیوں، رسم و رواج کے ڈھکوسلوں، تہذیبی سختیوں اور دیگر سماجی ممانعتوں کے خلاف صدائے احتجاج زیرِ لب بلند کرتا ہوا نظر آتا ہے جو انسان کی فطری آزادی میں مخل ہیں۔ خود انسان باہری یا بیرونی دباؤ سے انکار کر بھی دے تب بھی اس کا باطن اور اندرون تہذیبی، سماجی اور مذہبی اقدار کا اسیر ہے۔ اس سے رہائی کس طرح حاصل کرے۔ ان بیرونی اور اندرونی دباؤ سے آزادی حاصل کرنے کے لیے وہ کوشاں نظر آتا ہے۔

انسان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں جو تہذیبی، مذہبی، جغرافیائی اور سماجی عناصر کام کر رہے ہوتے ہیں، انسان چاہتے ہوئے بھی ان سے نجات حاصل نہیں کر پاتا۔ بہ قول روسو'' آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔'' فلسفۂ وجودیت کے سب سے بڑے حامی سارتر کے مقلد البرٹ کامو کے ناول ''بیگانہ'' کا کردار مرسال Reasoning کا قائل ہے اور زندگی کے حوالے سے ہر جگہ بے حس نظر آتا ہے۔ جذباتیت کا قطعاً منکر ہے مگر ناول کے آخری حصہ میں قتل کے جرم میں جب وہ جیل پہنچ جاتا ہے تو اس کی تمام معشوقائیں اس کے خواب و خیال میں آتی ہیں اور ان کی اس کو یادیں ستاتی ہیں۔ باوجود اس کو سزائے موت کا حکم ہو جاتا ہے۔ انسانی کردار کا یہ پہلو جذبہ و احساس سے تعلق رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر انسان کی شخصیت کی تکمیل عقلیت اور جذباتیت کی آمیزش سے ہوئی ہے نہ تو وہ نرا Reasoning ہو سکتا ہے اور نہ ہی Sentimental۔

اس افسانہ میں کردار کے ساتھ زندگی کے مختلف واقعات جڑے ہیں۔ جہاں ''وہ'' کے ساتھ پلنے والا پرندہ ''وہ'' کی رہ نمائی بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی صدائے احتجاج بلند

کرتا ہے۔ کہیں سفاک اور بے رحم، کہیں نرم طبیعت اور رحم دل نظر آتا ہے۔ بعض مواقع پر Reasonable اور کبھی کبھی Sentimental دکھائی دیتا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی موضوع بہ قول پروفیسر شافع قدوائی ''وہ اور پرندہ ایک گہرے مذہبی احساس اور روحانی تجربے کی کہانی ہے جس میں مذہب یا عقیدہ اپنے آخری تجزیے میں ایک عافیت کوش تجربے میں متقلب ہو جاتا ہے۔'' مطلب ظاہر ہوا کہ ''وہ اور پرندہ'' گہرے مذہبی احساس اور روحانی کرب پر مبنی افسانہ ہے۔ انسان کی ذہنی نشوونما اور اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں مذہبی تعلیمات، سیاسی رجحانات، سماجی اقدار، معاشرتی بود و باش، معاشی فراوانی، تنگیِ معاش اور تعلیمی اثرات کا مکمل دخل ہوتا ہے جو زندگی کرنے کے مخصوص انداز میں اور گزارنے میں ہر پل شعوری اور غیر شعوری طور سے انسان کے قول و عمل اور افعال و کردار میں نمایاں نقوش چھوڑتے ہیں، جہاں انسان کہیں بے بس اور مجبور نظر آتا ہے، جو اس کی جبلی خواہشات اور فطری آزادی پر دباؤ بنائے رکھتی ہیں اور احساسِ محرومی کو شدید تر کر دیتی ہیں اور اس افسانہ میں ہمیں لمحہ بہ لمحہ نظر آتی ہیں۔

نشہ کی حالت میں بار کے اندھیرے میں تنگ و تاریک گڑھا ہونے کا احساس، مرنے کے بعد زمین کو زبان مل جانا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کا حکم، قبر میں منکر نکیر کے سوالات، قبر کے عذاب کا خیال اور وہ تمام کیفیات جو مذہب کے حوالے سے ہمیں ملی ہیں، اس کے احساس و ادراک میں عود کر آجاتی ہیں مگر یہی پرندہ نفس امّارہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ''وہ'' کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ''اگر بھاگتی ہوئی زندگی سے چند لمحات مسرتوں کے چرا لیے جائیں تو پوری زندگی پر بھاری ہوتے ہیں.....اور.....پھر تم.....تم تھکے ہوئے بھی تو ہو.....آخر اس کا علاج کیا ہے؟'' جب کہ یہی پرندہ تھوڑی دیر پہلے ضمیر کی متشکل میں شراب کی ممانعت پر زور دیتا ہے اور قبر کے عذاب کا احساس کراتا ہے۔ یہاں فطرتِ انسانی کے اس گوشہ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ارتکابِ گناہ سے پہلے

ضمیر صراطِ مستقیم کے لیے رہ نمائی کرتا ہے لیکن اگر اس لمحہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہی ضمیر نفس امارہ کی شکل اختیار کر کے احساس گناہ کو دبا دیتا ہے۔

شراب پینے کے بعد جب ''وہ'' سڑک پر ڈگمگاتے قدموں کے سہارے چلتا ہے تو اس منظر کو افسانہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ''جیسے سڑک بال سے زیادہ باریک ہو اور تلوار سے زیادہ تیز دھار رکھتی ہو۔'' آگے افسانہ نگار اس طرح پیش کرتا ہے ___ ''اور سڑک پر اس طرح چلنے لگا جیسے نٹ تار پر چل رہا ہو۔ ہر قدم کو ناپ تول کر رکھ رہا ہو کہ غلط قدم رکھا اور نیچے گرا۔'' ___ اس بیانیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شراب پینے کے بعد سڑک پر احتیاط سے چلنے کے پیچھے دنیا کی نظروں سے اپنے آپ کو چھپانا مقصد ہے کیوں کہ پتا چلنے پر بدنامی اور بے عزتی ہو جائے گی۔

افسانہ کی شروعات شام کے جھٹ پٹے کے وقت سے ہوتی ہے۔ پوری رات کہانی چلتی ہے۔ کردار کی پوری زندگی ایک رات میں سمٹ گئی ہے۔ اسی لیے رات روزِ محشر کی طرح سخت اور طویل ہو گئی ہے۔ روزِ محشر کو تمام ہی پیدا ہونے والے انسان اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے۔ وہ یوم دین ہوگا۔ اس کو یومِ میزان بھی کہا جاتا ہے۔ ہر شخص کے اعمال کا حساب و کتاب ہوگا۔ ہر شخص اللہ کی پکڑ سے ہراساں اور پریشان حال ہوگا۔ تمام رشتے ناطے بکھر جائیں گے۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ ایک عجیب و غریب منظر ہو گا۔ ___ ''ذرا سا غور کرو، یہ کائنات کی تخلیق بھی ارتکابِ جرم کا سبب ہے۔ جس میں مشیت ایزدی بھی شامل تھی اور پھر یہ گناہ و سزا کا نہ ختم ہونے کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔'' افسانہ کا فن غزل کی طرح نازک فن ہے۔ زائد الفاظ کا بوجھ برداشت نہیں کرتا۔ ایجاز و اختصار، کفایت لفظی، علائم نگاری، زبان و بیان، میں استعارات و تمثیلات کے ذریعہ افسانہ کی ساخت میں معنی خیزی پیدا کی جاتی ہے۔ مابعد جدید تصور ادب میں جہاں کہانی، کہانی کے جوہر کی طرف لوٹی ہے وہیں پیچیدہ علامت نگاری، خود فراریت

''میں'' کی پاسراریت اور اندرون میں اپنے وجود کی تلاش سے بھی نجات ملی اور سماجی سروکاروں سے ربط وضبط ہموار ہوا۔ افسانہ نگار objects سے جوڑ کر ذہنی کیفیات اور دلی جذبات کو بیان کرنے میں کمال کا درجہ رکھتا ہے۔

افسانہ ''وہ اور پرندہ'' مجموعہ کا نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ ایک ایسے کردار کہانی ہے جو مذہب کا گہرا احساس رکھنے کے ساتھ ساتھ روحانی کرب، نفسیاتی اذیت اور ذہنی انتشار سے اس قدر دوچار ہے کہ اسے ہر قدم پر روحانی محرومی اور جذباتی تشنگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ اپنی توقعات وخواہشات کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے لیکن سماجی و مذہبی بندشیں اس کی آسودگی کا ہر اقدام ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ رنج وفرحت کے ممزوج پرچھائیاں، حیات وموت کی تلخ ترین سچائیاں مہیب سایوں کی طرح ہر آن اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ پرندہ دراصل اس کا ضمیر یا نفس ہے جو اس کی زندگی میں ''دخل در معقولات'' کا مرتکب ہو کر طرح طرح سے دِق کرتا ہے۔ کہیں تو اعمال ممنوعہ کو مزین و آراستہ کر کے نفس امارہ (گناہ کا حکم کرنے والا نفس) کا مصداق ہے۔ پرندہ کا ''وہ'' کی زندگی میں داخلہ ایک الگ کردار کی حیثیت سے ہوتا ہے جب کہ وہ ''وہ'' کی شخصیت کا ایک عنصر ہے۔ یہ افسانہ کی تکنیک میں خود ایک نیا اور کام یاب تجربہ ہے۔ افسانہ نگار اس کی موجودگی اور توانائی کا احساس علامتی انداز میں اس طرح کراتا ہے:

> ''اور اس پرندے کی اڑان کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب میں نے عزرہ کو فطری حالت میں اچانک نہاتے ہوئے دیکھا تو میرے جسم میں چیونٹیوں نے اپنے ڈنک گاڑ دیے پھر تو میں نے اس کے مکان اور اپنے مکان کا فاصلہ اس قدر تیزی سے طے کیا کہ گھر آتے آتے ہانپ گیا۔''

افسانہ کے اختتام تک پرندہ اپنی شمولیت کا احساس کراتا ہے۔ افسانہ نگار نے ایک غیر مرئی تصور کو پرندے کے حوالے سے کہانی کو بیان کرتا ہے۔ افسانہ کے آخر میں پرند

کی تمثیل، حقیقی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اچانک پرندہ اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ جیسے وہ ایک تصور یا خیال نہ ہو بلکہ حقیقت ہو۔ یہاں موتیف کو حقیقی شکل دینے سے افسانہ فطرت اور حقیقت کے قریب ہو گیا ہے۔ مذکورہ افسانہ فنی نقطۂ نظر سے کامیاب اور اہم افسانہ ہے۔ افسانہ کی منظر کشی اور فضا بندی کو علامتی زبان و بیان دے کر واقعیت سے جوڑنے میں افسانہ نگار کے کمالِ فن کی داد دینی پڑتی ہے۔ مکالمہ نگاری میں برجستگی اور موزونیت، قاری کو چونکاتی ہے۔ معنی آفرینی، گہرائی اور گیرائی مکالموں کی جان ہے۔ اندازِ گفتگو میں طنز اور نشتر کی کاٹ ملتی ہے۔ کرداروں کے ناموں کو معنی خیز بنانے میں پورا اہتمام کیا گیا ہے اور ان ناموں کو موضوع سے ہم آہنگ کر کے افسانہ کی ساخت کا ایک ناقابل تقسیم جز بنایا ہے۔ مذکورہ افسانہ میں ''سمن'' پھول کے معنی میں ''نکہت'' خوشبو کے معنی میں ''رضیہ'' تسلیم و رضا کے معنی میں اپنی مخصوص معنویت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ افسانہ نگار نے کرداروں کے ناموں کے مفاہیم سے نہ صرف فائدہ اٹھایا بلکہ اپنے علامتی لب و لہجہ اور زبان و بیان کے وسیلے سے افسانہ نگار میں معنی خیزی پیدا کی ہے لیکن افسانہ کی واقعیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مندرجہ اقتباس میں نکہت کا ورود ملاحظہ ہو:

> ''تم نے نکہت کو مشت میں قید کرنا چاہا لیکن بادِ صبا کا جھونکا اُسے اڑا کر لے گیا.... یکا یک دروازہ کی کنڈی کی آواز ہوئی۔ وہ چونک گئی۔ نہیں.... نہیں۔ کہہ کر نکہت پیچھے ہٹ گئی.... اور پھر وہ اپنے ہی خول میں قید ہو گئی۔ میز درمیان میں رکھی تھی۔ اس پر کتابوں کا بوجھ تھا .... رضیہ کی معصومیت تم نے نکہت کے اندر تلاش کرنی چاہی .... اور نکہت تمہیں کتابوں میں تلاش کرتی رہی..... حقیقت ''زندگی'' میں ملتی ہے، کتابوں میں نہیں....'' پرندہ نے یاد دلایا۔''

طویل افسانہ ''وہ اور پرندہ'' میں مختلف واقعاتی تأثرات کو منطقی ربط اور شعوری

طور سے وحدت قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے۔اس کہانی میں خارجی کردار نگاری اوران کے افعال و اعمال کے ساتھ داخلی کرب اور باطنی عمل پر زیادہ زور ملتا ہے۔افسانہ نگار نے اندرون میں داخل ہوکر ہمیں اس کے ذہنی رویوں اور روحانی کوائف کی سیر کرائی ہے۔عمومی طور پر موضوع کی مناسبت سے مرکزی کردار کے رویے ظاہر کیے جاتے ہیں لیکن کردار کے کسی فعل وعمل کا ضمنی کرداروں کا کیا ردِّ عمل ہوا،اس پہلو پر افسانہ نگاروں کی کم ہی توجہ جاتی ہے چوں کہ فنِ افسانہ کا موضوعی احاطہ اور افسانہ نگار کے دائرۂ اختیار کے بس سے باہر ہے۔چوں کہ کہانی کار کو کردار کے مخصوص رویہ اور جذبہ سے غرض ہوتی ہے۔اس جذبہ اور رویہ کا ضمنی کردار پر کیا تاثر قائم ہے،اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔یہاں اس گوشہ کو اجاگر کرنے میں افسانہ نگار نے ایک نئی تکنیکی،ہیئتی اور اسلوبیاتی تجربہ کے حوالے سے بہت ہی کام یاب افسانہ تخلیق کیا ہے۔

افسانہ حیات وممات کا تخلیقی استعارہ ہے۔یہ استعارہ انسانی نفسیات،جنسیات کے پیچ وخم کا،پیکارِ حیات کے نکات ورموز جاننے کا،حیات وکائنات کے مسلسل تصادم کی فتح وشکست کی روداد سنانے کا،انسان کے افعال واعمال کے پس پشت جو عوامل کام کررہے ہوتے ہیں،ان کی تلاش کا،فرد اور اجتماع کے ذہنی اور جذباتی رشتوں کی کہانی سنانے کا ،انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تعمیر وتشکیل میں جو سماجی ،نفسیاتی،تاریخی وجغرافیائی اور مذہبی عناصر کام کررہے ہوتے ہیں،ان پر غور وفکر کرنے کا رول افسانہ ادا کرتا ہے اور اسی روشنی میں احمد رشید (علیگ) نے افسانے لکھے ہیں۔

افسانہ نگار کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کا ادب کے کسی رجحان ،انفرادی یا اجتماعی نقطۂ نظر سے جڑنا ناگزیر ہو۔اس طور پر احمد رشید کی کہانیاں زمانی قیود سے آزاد ہیں۔اس لیے انہیں کسی مخصوص نقطۂ نظر سے جوڑ کر سمجھنا مناسب نہیں ہوگا۔ان کے افسانوں میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سامنے نظر آنے والے واقعات کو اس طرح سے پیش

کرتے ہیں کہ اس میں تخلیق مکرر جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ان میں معنی کی نئی سطح ابھر کر سامنے آتی ہے کہ سامنے کے دیکھے بھالے واقعات بھی انوکھے اور نئے نظر آنے لگتے ہیں۔ زیریں سطح پر ایک اور کہانی غور و فکر کے بعد دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح ان کی کہانیاں مابعد جدید تصور ادب ''بین المتونیت'' سے تخلیقی سطح پر استفادے کی خبر دیتی ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مابعد جدیدیت تخلیقی آزادی کا کھلا رویہ ہے، ادبی جبر توڑنے کا، معنی کے چھپے ہوئے رخ کو دیکھنے اور دکھانے کا، ثقافتی صداقت اور تہذیبی حقیقت کو تلاش کرنے کا۔ ادب کو انسانی کلچر سے جوڑنے کا رجحان ان کہانیوں میں ملتا ہے۔ احمد رشید نے بھی اپنے افسانوں کو ماورائی تصورات و ثقافت کی ابتدا اور ارتقا کو عوامی مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں ایک طرف ماورائیت، دوسری طرف زمینی مسائل سے ارتباط فنی چابک دستی کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کی کہانیاں پس ساختیات، ایک متن پر دوسرے متن کی تخلیقی سطح پر پتا دیتی ہیں۔ افسانہ نگار نے انسان اور کائنات کے رشتے کو تخلیقی سطح پر جوڑ کر کہانیاں لکھی ہیں، ان کے افسانوں میں تہذیب شعور کی جڑوں کی تلاش، اس تلاش کی لامحدودیت ہمیں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے معنی کی مرکزیت سے انحراف کرتے ہوئے معنی کی تہہ داری موضوعاتی سطح کے علاوہ مکالموں اور جملوں کی ساخت تک میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اسلوب و زبان، تکنیک، موضوع اور کرداروں کو فنی وحدت میں اس طرح مدغم کیا ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے نئے ذائقے کا احساس ہوتا ہے اور افسانہ ''وہ اور پرندہ'' ان کی تخلیقیت کی عمدہ مثال ہے۔

احمد رشید کے افسانوں میں مذہبی احساس بار بار مختلف حوالوں سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسی ضمن میں افسانہ ''سراب'' کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ گہرے مذہبی احساس پر مبنی ہے۔ تخلیق کائنات اور تخلیق انسان کے موضوع پر اسلامی نظریہ کو بڑے سلیقے کے ساتھ اس افسانہ میں نبھایا گیا ہے۔ یہ کائنات وسیع و عریض اور اپنے حسن و جمال کی وجہ

سے دلفریب ہونے کے باوجود ایک فریب اور دھوکا ہے جسے ہم سراب سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ خداوند قدوس کی نظر میں اس کی حیثیت ایک مچھر کے پر کے برابر کی بھی نہیں ہے اور انسان اس کی خوبصورتی اور رعنائی میں اس قدر ڈوب گیا ہے کہ نہ تو اپنی موت اور نہ ہی اس کائنات کے فنا ہونے کا احساس یاد ہے۔ دنیائے آب وگل میں انسان کو اتارنے سے پہلے خدا اور انسان کے درمیان ہونے والے مکالمہ سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے لیکن دنیا میں آنے کے بعد انسان اپنے وعدہ سے پھر جاتا ہے اور اس کائنات کی رنگینی اور خوبصورتی میں کھو جاتا ہے اور خدا سے کیے ہوئے قول وقرار کو بھول کر تعیش پسندی اور لہو ولعب میں مبتلا ہو کر وہ اپنے نفس کا غلام ہو جاتا ہے جب کہ غلامی کا وعدہ وہ خدائے برتر سے کرتا رہتا ہے۔ یہاں بھی انسان کے ارتکاب جرم کی فطرت کا واضح اظہار ملتا ہے۔ جب انسان اس کائنات میں آتا ہے تو سب سے پہلے اس کے کان میں ایک شبد ''شکتی'' بولا جاتا ہے اور اسے اس کی کمزوری اور کمتری کا احساس کرایا جاتا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق ایک غلیظ بوند سے ہوئی ہے اور جب تک وہ مادر رحم میں ہوتا ہے، اس کا کھانا پینا بھی گنداخون ہوتا ہے باوجود اس کے انسان سرکش اور مغرور ہو جاتا ہے جہاں اس کی یہ احسان فراموشی ہے وہیں اس کے غرور کے منھ پر ایک طمانچہ بھی ہے۔ گناہ کرنا انسان کی فطرت ہے مگر اس کو فطرت کے خلاف مذہبی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہوتی ہے اور وہ کہنے لگتا ہے ''مگر میں قید ہوں ایک خوبصورت قید خانہ میں حکم یہ کہ خوبصورتی کی کالونچ سے بچو یوں کہ تمہیں سفید کُرتا پہنایا گیا ہے''۔ لیکن جب انسان نے رو میں کو تلاش کرایا اور اسے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہوا تو شکتی اور انسان کے درمیان مفارقت پیدا ہو گئی لیکن جب انسان خدا کے سامنے اقبال جرم کر لیتا ہے اور وہ توبہ واستغفار کرتا ہے تب ہی مفارقت، رفاقت میں تبدیل ہوتی ہے۔

افسانہ ''سراب'' میں اسلامی اساطیر کو عصری تقاضوں سے مربوط کرنے کی فنکارانہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ دنیا اور اس کی حشر سامانیاں قیامت کے خوفناک منظر سے

کچھ کم نہیں ہیں جہاں انسان نے اپنی پہچان اور شناخت کو کھو دیا ہے اور وہ اپنی شرافت اور انسانیت کا ڈھونگ کرتا ہوا ''پاداش کا صراط مستقیم'' کی تلاش میں بھاگ رہا ہے ۔اچانک اس کی ملاقات ایک بزرگ سے ہو جاتی ہے جو اپنے سر کی ٹوپی اس کے سر پر رکھ کر اس خوبصورت کائنات اور شریف انسان کی پوشیدہ صورت اور حقیقت دکھاتا ہے اور وہ انسانی صورتیں اچانک جانوروں کی شکل میں بدل جاتی ہیں اور ان کی بری خصلتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ وہ بزرگ احساس کراتا ہے کہ بے شک انسان کی تخلیق اسفل ترین شے سے ہوئی ہے لیکن اس خاکی مخلوق کو اشرف المخلوقات کا منصب خالق کائنات نے عطا کیا ہے۔ اسی کے لیے یہ خوبصورت کائنات سجائی گئی ہے اور عمر کے مختصر عرصہ کے بعد انسان موت کے ہمکنار ہو جائے گا اور ایک دن قیامت کی ہولناکی اس خوبصورت کائنات کو نیست و نابود کر دے گی۔ افسانے کا اختتام پر قیامت کے خوفناک منظر کا بیان ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ بزرگ کی زبانی قیامت کے ہولناکی منظر کا ذکر سن کر حیوانِ ناطق چیخ پڑتا ہے اور خوف زدہ ہو کر انسانوں کے جم غفیر میں شامل ہو جاتا ہے۔

ہمارے کہانی نگار نے مذہب پر قدغن لگانے اور مذہب میں پنپنے والی برائیوں کے ساتھ سیاست کے موضوع کے ساتھ کھل کر بحث کی ہے۔ یہ موضوع اس بات کی جانب دلالت کرتا ہے کہ افسانہ نگار نئے تقاضوں اور نئی سیاست سے پوری طرح واقف ہے۔ اسی حوالے کی ایک کہانی ''پیشینگوئی'' ہے۔ ''پیشگوئی''، تمثیلی انداز میں سیاسی مکاریوں کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی بہ ظاہر مذہبی تاریخ کا افسانہ ہے جس میں اقلیتی، اکثریتی فرقوں کے درمیان سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی کشمکش کا فنّی اظہار ہے۔ موجودہ کائنات میں اقلیتی فرقہ کی تہذیبی شناخت اور سیاسی تشخص کے مسائل کرۂ ارض کے ہر خطہ میں پیچیدگی اختیار کر چکے ہیں۔ افسانہ اسلامک

سائکلو جی اور ہندو متھالو جی کو عصری تقاضوں سے جوڑ کر تخلیق ہوا ہے۔ بہ ظاہر ''پیشگوئی'' میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کو بیان کیا ہے لیکن بین السطور جمہوری نظام پر سوالیہ نشان قائم کیا گیا ہے۔ آج جدید دور میں جمہوریت کو سب سے اعلا نظام حکومت خیال کیا جاتا ہے لیکن کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اس نظام حکومت کا استحصال نہیں ہوا ہو اور اس کا ناجائز استعمال نہ ہو رہا ہو۔ اس نظام حکومت میں عوام کو ووٹوں کی سیاست میں مصروف ایک مہرہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سیکولرزم، سوشلزم جو جمہوریت کے بنیادی عناصر ہیں جو ایک ڈھونگ بن کر رہ گئے ہیں۔

افسانہ ''پیشگوئی'' کی کہانی اس طرح ہے کہ نجومی اطلاع دیتا ہے کہ غلام گروہ میں فلاں دن فلاں تاریخ کو ایک بچہ پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر قابوس (فرعون) کی شاہی زوال کا سبب بنے گا۔ اس خوف سے بادشاہ تخلیقی عمل پر سختی سے پابندی عائد کرنے حکم جاری کر دیتا ہے۔ اس سال پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کرا دیا جائے۔ یہاں تک کہ مباشرت کے عمل کو بھی شجر ممنوعہ قرار دیتا ہے لیکن قدرت کا نظام برحق ہے وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے فیصلے کسی کے پابند نہیں۔ فنا و بقا اسی کے اختیار میں ہے۔ اسی لیے قینان (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کو پیدا ہونا تھا، وہ ہو کر رہے۔ یہاں حیرت و استعجاب کی گنجائش نہیں کہ یہ قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے کہ خود قابوس کے بستر پر ہی قینان کا حمل ٹھہرا۔ خوف کی وجہ سے عمران (موسیٰ علیہ السلام کے والد) نے اس نوازائیدہ کو ایک دریا میں چھوڑ دیا۔ وہ بچہ تیرتا ہوا قینان کی سرحد پر پہنچا، جہاں قابوس اور اس کی بے اولاد بیوی سیر و تفریح میں مصروف تھے کہ اچانک بچہ پر نظر گئی۔ ممتا و محبت سے مملو ماں نے اس کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی پرورش کرنے کا دل میں ٹھان لیا۔ نتیجتاً بچہ قابوس کے محل میں پلنے لگا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوا اور اس کا ادراک و شعور بالغ ہوا، اس نے پیغام حق عام کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جوق در جوق لوگ اس کے دست حق پر بیعت کرنے لگے۔ جگہ جگہ اس نے ہدایت کی شمع روشن کرنا شروع

کر دیا۔ قابوس کے سر پر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہاں تک کہ حق گویوں کا ایک طاقتور گروہ تیار ہو گیا اور اس نے انقلاب کا نعرہ لگا دیا۔ قابوس کی مکمل مزاحمت کے باوجود وہ اس طوفان کو نہیں روک سکا اور ایک دن محل کے در و دیوار ہلنے لگے۔ آخر کار وہ طوفان اس کی حکومت پر قابض ہو گیا اور قابوس کو قید کر لیا گیا۔ منصف نے فیصلہ دیا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ قابوس نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا لیکن اس نے ہمیشہ لوگوں کو قتل کرنے کے لیے اُکسایا ہے۔ اس لیے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے''۔

بین السطور میں اندرا گاندھی کے دور حکومت کی کہانی کا گمان ہوتا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں خاندانی منصوبہ بندی کی غرض سے محافظان ملک (پولس) نے نس بندی کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے بہت ہی وحشت ناک کردار ادا کیا تھا۔ اکثریت میں ایک مخصوص طبقہ اقلیتی فرقہ کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ وہ اقلیتی فرقہ کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کی مسلسل کوشش میں لگا ہوا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کرانے کی ایک وجہ ان کی معیشت کو تباہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان کو تعلیمی اعتبار سے بس ماندہ کرنا بھی ان کی پالیسی میں شامل ہوتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے سیاسی منظر نامہ پر نظر ڈالیں تو اقلیتی طبقہ تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل سے بھی جھوجھ رہے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی تہذیب اور معاشرت کو کچلنے کی سازشیں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔

کہانی کا عنوان ''پیشگوئی'' پوشیدہ طوفان کی طرف کنایہ ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ظالم اور مغرور شہنشاہوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر عوام کا غصہ ایک طوفان کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو ملک و قوم کی تقدیر بدلنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوری نظام رائج ہے لیکن اس کی ناکامیاں اور خرابیاں بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ جمہوری نظام کی تعریف ''عوام کی حکومت، عوام کے ذریعہ عوام کے لیے'' نے اپنے نفی و مفاہیم کو کھو دیا ہے یا یوں کہہ لیجئے اس کی اصل

شکل وصورت کو بگاڑ دیا ہے۔ داعیان قوم اور سیاسی رہنماؤں نے اپنے نجی مفادات کے حصول کے لیے اس نظام حکومت کا اس قدر استحصال کیا ہے کہ اس کی قدر و قیمت گھٹتی جارہی ہے۔ ذاتی اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لیے جمہوریت اور سیکولرزم کو ڈھونگ بنا کے رکھ دیا گیا ہے جو یقیناً خوش آئند ہیں۔ مصنف نے افسانہ میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج جدید دور میں ابراہم لنکن کی تعریف فرسودہ ہوگئی ہے اور نئی معنویت کے ساتھ ہمارے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ ''اکثریت کی حکومت اکثریت کے ذریعہ اکثریت کے لیے''۔ مصنف نے افسانہ کو عصری صورت حال کو مذہبی روایت سے جوڑ کر ایک نئے معنی و مفاہیم سے آشنا کیا ہے۔ تمثیلی انداز میں جدید معنی دے کر کہانی کو تہہ داری عطا کی ہے۔ ہندو دیو مالا اور اسلامی فکر کی آمیزش سے افسانہ ملی جلی تہذیب کا عکاسی کہنے کے بجائے کثرت میں وحدت کا نمونہ نظر آنے لگتا ہے۔

کہانی ''بن باس کے بعد'' فرسودہ مذہبی روایتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اس میں ماورائی اساطیری فضابندی کی گئی ہے، ساتھ ہی افسانہ میں اسلامی اساطیر اور ہندو متھ کی معنویت کو عصری صورت حال کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فساد کے بعد جو اثرات انسان کی زندگی پر نمایاں ہوتے ہیں ان کا اظہار افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ فنّی نقطۂ نظر سے بھی یہ کہانی بڑی موثر اور منفرد ہے۔

علائم نگاری اور استعاراتی اسلوب سے فساد کے منظر کو تخلیقی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ میں جانکی بنیادی کردار ہے جو چودہ دنوں تک فساد میں گھری رہتی ہے اور جب وہ اپنے گھر واپس ہوتی ہے تو اس کو اپنی پاکیزگی ثابت کرنے کے لیے اگنی پریکشا سے گزرنا ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ اگنی پریکشا میں کامیاب ہوجاتی ہے پھر بھی مرد کے طنز و تعریض کا نشانہ بنتی ہے۔ وہ اپنوں کے نازیبا سلوک سے تنگ آجاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ وہ جہاں تھی، وہ اس کے لیے معقول جگہ تھی۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے راجندر سنگھ

بیدی کے افسانے ''لاجونتی'' کی یاد آتی ہے جہاں 'لاجو' کے ساتھ بھی یہی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ بیدی کے افسانے کے ماسوا احمد رشید کے افسانے میں نسائی حسیت کی مختلف جہتوں کو فن کارانہ شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی عورت کی جذباتی کیفیات اور اس کے اندرونی کوائف کو بڑی چابک دستی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں ''طوطا'' ان فرسودہ روایتوں پر جن پر انسان عقل وخرد کی آنکھیں بند کر کے سختی سے پابند رہتا ہے، کی علامت کے طور پر وارد ہوتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مردوں نے عورت کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے حالاں کہ وہ اس کائنات کے آدھے کی حصہ دار ہے۔ اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں بھی عورت مرد کے آگے مجبور اور بے بس نظر آتی ہے۔ مرد ہی اسے اپنی شہوت اور ہوس کا شکار بناتا ہے، مرد ہی اس کی اگنی پریکشا لیتا ہے، مرد ہی قاتل ہے اور منصف بھی وہی ہے۔ انصاف ملنے کے باوجود بھی اس کی زندگی طنز وتعریض کا تازیانہ بن جاتی ہے۔ ''جانکی'' کی عصمت بھلے ہی محفوظ رہی ہو جو اگنی پریکشا سے بھی ثابت ہو چکی ہے لیکن پھر بھی بدنامی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔ افسانہ کی معنویت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ بہ ظاہر کہانی جانکی اور رگھوبیندر کے اردگرد گھومتی ہے لیکن بین السطور میں رام اور سیتا کی کہانی (جو چودہ سال کا بن باس کاٹ کر ایودھیا واپس آتے ہیں) معلوم ہوتی ہے۔ چوں کہ اس درمیان میں راون سیتا کا ہرن کرتا ہے اور سیتا کو اگنی پریکشا سے گزرنا پڑتا ہے۔ کامیابی کے بعد بھی کہانی ختم نہیں ہوتی بلکہ اگنی پریکشا کا یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہتا ہے۔ جب ایک دھوبی گھر سے غائب ہونے پر اپنی بیوی کو مار پیٹ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''میں رام تھوڑی ہوں جو انہوں نے سیتا کو گھر میں رکھ لیا تھا۔'' رام کے کانوں میں جب یہ آواز آتی ہے تو وہ سیتا جی کو لکشمی کے ہاتھوں جنگل میں چھڑواتا ہے۔ اس طرح کہانی کا عنوان ''بن باس کے بعد'' بڑا معنی خیز ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ سیتا کو ''جانکی'' اور رام کو ''

رگھویندر'' بھی کہا جاتا ہے۔

رام چند ایک دیوتا تھے۔اس کے باوجود انسانوں کے اس سماج میں وہ بھی مجبور نظر آتے ہیں اور سیتا کے حق میں وہ ایک مذاہب فیصلہ نہیں لے سکے لیکن ''بن باس کے بعد '' کا راگھویندر پنجڑے سے طوطے کو آزاد کردیتا ہے۔ راگھویندر، جانکی کو گلے سے لگا لیتا ہے۔افسانہ کا انجام طربیہ اور پُر امید ہے اور معنی خیز جملوں پر ختم ہوتا ہے۔اس طرح یہ کہانی روایت، مذہبی اجارہ داری کے خلاف صدائے احتجاج کی طرف نشاندہی بھی کرتی ہے۔

جنس ایک ایسی جبلت ہے جس کا توانا اظہار عالمی ادب کے مختلف زبانوں میں الگ الگ زاویوں سے ہوتا رہا ہے۔یونانی ادب،عربی ادب،انگریزی اور دوسرے ادبیات میں جنسی استعارے کی پوری روایت موجود ہے۔ ہندوستان میں سنسکرت کے حوالے سے بات کریں تو یہاں بھی جنسی اظہار کی پوری روایت موجود ہے۔اردو افسانہ، چوں کہ مغربی صنف سے مستعار ہے اس لیے یہ اپنے کمزور و ناتواں کاندھے پر ہر تحریکات ورجحانات کا بوجھ برداشت کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔اردو افسانے میں اس حوالے سے ابتدائی کاوشیں کی جاتی رہی ہیں۔ یلدرم کے ترکی تراجم اس حوالے سے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یلدرم کے بعد نیاز، مجنوں وغیرہ کی چند تخلیقات میں اشارۃً جنسی مسائل کو دبے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ معتوب زدہ افسانوی مجموعہ اس حوالے کی پہلی کوشش تھی۔''انگارے''میں شامل افسانہ ''جنت کی بشارت'' کے کردار مولانا داؤد پر قاری کی نظر جاتی ہے تو قاری کے ذہن میں مذہب سے متعلق فرسودہ روایات،قول وفعل میں تضادات کا جواز، جنت الفردوس کی ابدی خواہش، نیک عمل کے پس منظر میں جنتی عورتوں (حوروں) کی تمنا اور نہ جانے کن کن نکات کی جانب قاری کا ذہن بھٹک جاتا ہے۔ترقی پسندی کے دور میں منٹو،عصمت پر لگے الزامات،ش مظفر پوری اور سید محمد محسن کے افسانوں میں جنس کی عکاسی اور بعد کے افسانہ نگاروں کی نثری کاوشیں جنس کے اظہار میں اہم رول ادا کرتی

ہیں۔ ہم عصروں افسانہ نگاروں میں شموئل احمد، عارف خورشید، م ناگ، مشرف عالم ذوقی، شاہد اختر، اشتیاق سعید، صغیر رحمانی، شبیر احمد، اختر آزاد اور دوسرے افسانہ نگاروں میں اس روایت کی توسیع ہوئی ہے۔ احمد رشید کا شمار بھی انھی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی جنس کو موضوع بنا کر کئی اہم کہانیاں رقم کی ہیں لیکن ان متون میں انھوں نے اپنی بات کو ڈھکے چھپے انداز میں بیان کیا ہے۔ ''تیسری شخصیت''، ''لال تکون''، ''فول.... پھول''، ''برف تلے''، ایک خوبصورت عورت''، ''نیلم''، ''چھت اڑ گئی'' اور ''ہاف بوٹل بلڈ'' جیسے افسانوں کو کسی طور پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس ضمن میں ان کے افسانے ''دوسال بعد'' کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس افسانہ میں تانیثیت اور نسوانیت کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خواتین کے حقوق کی تحریکات مختلف ادوار میں مختلف سطحوں پر چلتی رہی ہیں البتہ ان میں زیادہ تیزی انیسویں صدی عیسوی میں آئی اور بیسویں صدی عیسوی میں نسائی تحریک Feminism کو زیادہ کامیابی ملی۔ حالیہ برسوں میں ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ جملہ معاملات زندگی میں عورت ہر قید کو توڑ کر آزادی کی خواہاں نظر آتی ہے۔ حالاں کہ عورت کی اہمیت اور وجود سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ وجودِ زن سے اس کائنات کی خوبصورتی قائم ہے۔ عورت کے بنا یہ کائنات ادھوری رہتی۔ اس کائنات میں وہ برابری کی حقدار ہے۔ آدھے آسمان، آدھی زمین کی وہ مالک ہے مگر پھر بھی وہ ہمیشہ اپنے حقوق سے محروم رہی ہمیشہ مردوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ سماج میں اس کی حیثیت دوئم درجہ کی رہی ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر Feminism نے تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ زندگی کے ہر معاملہ میں عورت آزادی کے حصول کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں عورت کو مرد کی شکتی کہا گیا ہے کہیں کہیں مرد کی ترقی میں عورت کا دخل ہونے کا بار بار ہمیں ذکر سننے کو ملتا ہے۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''سورج جو نیزوں کی نوکوں پر کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ پوری
کائنات کو جلا کر ہی دم لوں گا۔''

کہانی کے شروع میں Ring-o-Bell ہوٹل کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ہوٹل روشن میں نہایا ہوا ہے۔ نیتا نام کی رقاصہ اسٹرپ ڈانس سے ہوٹل کو گرما رہی ہے۔ لوگوں کی آنکھیں'' کولہو اور پستالوں پر جمی ہوئی ہیں اور وہ ان سب کا بوجھ اٹھائے بڑی مستی میں ادھر ادھر ہال کی گیلریوں میں رقص کرتی ہوئی داد نظارہ دے رہی ہیں۔ اچانک دیکھنے والوں کو رقص میں شامل ہونے کی دعوت ملتی ہے اور ہال میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس درمیان ایک نوجوان کے ڈرنک میں شامل ہونے کے لیے اس لڑکی نے اجازت چاہی۔ دونوں نے شراب پی اور اسموکنگ Smoking کی۔ لڑکی سے باتیں کرنے کے لیے نوجوان نے لان میں جانے کے لیے اصرار کیا۔ وہ دونوں بے تکلفی سے زندگی کے مختلف موضوعات اپنی پسند و ناپسند پر گفتگو کرتے رہے۔ لڑکی کے اظہار خیال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ Liberal Minded عورت ہے۔ آزادی کی دلدادہ اشوک سکندر، اکبر سے اسے اس لیے نفرت ہے کہ یہ سب ڈکیٹر تھے۔ اس کے خیال میں:

''مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے کہ زندگی بھر طوائفوں
جیسی زندگی گزارتے ہیں اور بڑھاپے میں رامائن کا پاٹھ کرتے ہیں''

لڑکی نے کہا۔

یہ انسانی تہذیب کی روایتوں اور ثقافتی قدروں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ ساتھ ہی شرافت اور انسانیت کے اصولوں کو وہ ڈھونگ قرار دیتی ہے کیوں کہ ان میں ظاہر داری نظر آتی ہے۔ چغلی کرنا، حسد، تعصب، نفرت یہ ان لوگوں کی ذہنی بیماریاں ہیں جو شرافت کا لبادہ پہنے ہوتے ہیں۔ کہانی کے دوسرے حصہ میں نوجوان جرمنی میں بھرپور زندگی جیتا ہے۔ عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی زندگی گزارتا ہے۔ وہ ایسی عیش و عشرت کی اس زندگی کو

یاد کرتے ہوئے وہ سوچتا ہے ''میں نے دو سال کے عرصہ میں ہندوستان کی تیس سالہ زندگی سے کہیں زیادہ عشق کیے ہیں''۔ یہاں یہ پتا چلتا ہے کہ معاملات عشق میں مرد قطعاً سنجیدہ نہیں ہے بلکہ اس کی طبیعت میں لا اُبالی پن ہے۔ افسانہ کا آخری حصہ اس لیے معنی خیز ہو جاتا ہے کہ اس میں پہلا حصہ نظریۂ لبرل ہیومن ازم Liberal Humanism کی نفی ہو جاتی ہے۔ خصوصی طور سے free Sex کی، کیوں کہ عورت کی جبلت سے یہ نظریہ میل نہیں کھاتا۔ عورت کی بنیادی فطرت اس کی شرم وحیا، نزاکت اور نسوانیت میں پوشیدہ ہے۔ عورت کی فطرت اور طاقت اور مرد کی فطرت اور طاقت دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرد اس لیے مرد ہے کہ اس کے پیچھے عورت کی طاقت مستتر ہے اور عورت اس لیے عورت ہے کہ اس کے پس پشت مرد کی شکتی پوشیدہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔

یہاں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ وہ لڑکی جب ایئر پورٹ پر لڑکے کو چھوڑنے آتی ہے تو رخصت کرتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں اور جاتے وقت اپنے ہاتھ سے بُنا ہوا سوئٹر اس کو تحفہ دیتے وقت ایک وعدہ لیتی ہے ''وہاں کا وہیں چھوڑ کر آنا'' یہاں یہ محسوس ہوتا ہے جنس Sex سے شروع محبت Love سے سنجیدگی اور Devotion میں بدل چکا ہے کیوں کہ صدیوں کی تہذیب میں شخصیت کی نشو ونما میں ایسی طاقت توانائی ہوتی ہے کہ تانیثیت کا جذبہ میں ادراک وشعور آنے تک موم کی طرح پگھل جاتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں عورت کو مرد کی شکتی کہا گیا ہے لیکن افسانہ کے اختتامیہ جملوں میں اس کا اظہار دوسرے انداز میں ہوا ہے کہ عورت کے پاس شکتی مرد کی مستعار ہوتی ہے۔ اپنی ذات میں عورت نسوانی کمزوریوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو احمد رشید کا یہ افسانہ عورت ومرد کی یکساں صورت حال اور مساوات کی جانب بھی اشارے دیتا ہے ساتھ ہی یہ کہ دونوں جنس ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

احمد رشید کے افسانوں میں ''عورت'' مختلف انداز سے برآمد ہوتی رہی ہے۔ عورت ذات کی شخصیت کی تفہیم ان کے افسانوں میں مختلف حوالوں کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا ہے۔ مثلاً ''چھت اڑ گئی'' میں اس کائنات کو ایک خوب صورت عورت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک شخص دنیا کو حاصل کرنے کے لیے دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ وہ نشے کی حالت میں ہے اور دنیا اُسے بہت خوبصورت نظر آرہی ہے۔ نشے کے عالم میں وہ اپنی نو بیاہتا دلہن کا بستر سمجھ کر قبر میں لیٹی ایک مردہ عورت سے لپٹ جاتا ہے لیکن جب اس کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے تو وہ چونک پڑتا ہے اور اس پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ نشے کی حالت میں دنیا خوبصورت دکھائی دیتی ہے اور جیسے ہی نشہ کافور ہو جاتا ہے تو اس کی حیثیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کہانی کار ''بائیں پہلو کی پسلی'' میں عورت کے استحصال کی داستان تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اس کہانی کی عورت کردار، جو کہ ماڈرن ہے، خود مختار ہے اور اپنی مرضی کی مالک بھی ہے پھر بھی وہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہے۔ نوکری اور زندگی کی دوسری مصروفیات سے اکتا کر جب وہ تنہا ہوتی ہے تو عورت کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ کل بھی عورت اپنا وقار، اپنی عظمت ڈھونڈ رہی تھی اور آج بھی اس کے لیے کوشاں ہے۔ عورت کو آج بھی وہ مقام حاصل نہیں ہوا ہے جس کے لیے وہ ایک زمانے سے بیتاب ہے۔ اسی تسلسل کی کہانی ''فیصلے کے بعد'' ہے جہاں عورت ایک مزاحمتی انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کہانی میں اہم بات یہ ہے کہ عورت آزادیٔ نسواں کی قائل ہے، ساتھ ہی اس کا شوہر بھی آزاد طبیعت اور کھلے ذہن کا مالک ہے، پھر بھی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہوئے علاحدگی اختیار کر لیتے ہیں اور دونوں میں طلاق ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں فسادات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ فساد کی یلغار یوں تو پوری دنیا جھیل رہی ہے اور ہر ملک اس مسئلے کے تئیں ہراساں ہے۔ فسادات میں

انسانوں کی ایسی جذباتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر شخص اس کو صاف طور پر محسوس کر سکتا ہے۔فن کار چوں کہ زمانے کا نباض ہوتا ہے،اس لیے فن کار کا متاثر ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں بھی فسادات کا ادب وافر مقدار میں رقم کیا گیا ہے۔احمد رشید کی بھی چند کہانیاں اس ضمن میں حوالے کے طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔افسانہ ''سہما ہوا آدمی''میں فساد کو ہی براہ راست موضوع بنایا گیا ہے جس میں مذہب کی بنیاد پر انسانیت کا قتل کیا جاتا ہے۔اس کہانی کا کردار فساد سے بچنے کے لیے اپنے ٹانگوں کے درمیان کا مذہب چھپا کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔اس کی شہادت کے بعد جب اس کی لاش ملتی ہے تو اس کا عضو تناسل غائب ہوتا ہے۔اس افسانے میں کہانی کار نے فساد کی اس نفسیات کی جانب اشارہ کیا ہے جہاں مذہب اندھی تقلید کے نتیجے میں جنم لیتا ہے اور وحشیانہ عمل اختیار کر لیتا ہے۔فساد کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ایک عورت کا استحصال کرتے ہوئے انسانیت شرمسار بھی نہیں ہوتی ہے۔افسانہ ''بی بی بولی'' کا موضوع فساد میں گھری عورت کے ساتھ ہوئے استحصال کی جانب اشارہ کرتا ہے،عورت کے ساتھ ہوئے ظلم وستم کو سنتے ہوئے لوگوں کے جسم کانپ اٹھتے ہیں لیکن اس عمل کو انجام دیتے ہوئے لوگوں کی حس مرجاتی ہے اور وہ اس کام کو فرض سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔اسی ضمن کی ایک کہانی ''ایک خوبصورت عورت'' بھی ہے جہاں عورت ہی ہوس کا شکار بنی ہے۔یہ کہانی یوں تو گجرات میں ہوئے فساد کی یاد دلاتی ہے جہاں انسانیت کے ساتھ کھلواڑ کا ناٹک کیا گیا اور عورت کو استعمال کیا گیا۔فساد میں گھری عورت کو لوگ نعمت غیر مترقبہ تصور کرتے ہیں اور گھناؤنی حرکت کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

احمد رشید کے موضوعات کی بات کریں تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے تمام بڑے موضوعات کا اپنے افسانوں میں احاطہ کیا ہے،خواہ وہ انسانیت کی بے مروتی کا بیان ہو یا دنیا سے ختم ہوتی تہذیب کا المیہ،عدم مساوات کا رونا ہو یا سیاسی رسہ کشی کا عالمی منظر نامہ،عورتوں

کا استحصال ہو یا مفلسی و دنیا کی بے ثباتی کا ذکر، الغرض ہر موضوع پر ان کے افسانے ہمیں پڑھنے کو مل جائیں گے۔ سیاسی رسہ کشی پر ان کی کئی کہانیاں ہیں جن میں ''ناخدا''، ''مداری''، ''حاشیہ پر'' اور اندھا قانون'' قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ''ناخدا'' کا موضوع امریکہ کی چودھراہٹ ہے۔ آج پوری دنیا میں جو افراتفری نظر آتی ہے اس کا وہی ذمے دار ہے۔ اس پس منظر میں احمد رشید نے کھلے طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ امریکا کی چودراہٹ کا زوال ہونے والا ہے کیوں کہ ہر عروج کے بعد زوال کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح ''مداری'' اور ''حاشیہ پر'' جیسے افسانے بھی سیاسی موضوعات پر مبنی کہانیاں ہیں جہاں پر اقلیتی اور اکثریتی طبقے میں کشمکش جاری ہے اور ان کے تصادم سے طرح طرح کے مسائل پنپنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی اس افسانے میں مسلمانوں کی تہذیبی شناخت پر بھی راوی سوالیہ نشان قائم کرتا ہے کہ اپنی شناخت کا مسئلہ بہت باریک اور نا قابل برداشت ہے۔ افسانہ ''مداری'' میں تو سیاسی رہنماؤں کو مداری کی تمثیل کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ کہانی مداری کے تماشے اور اس کی چرب زبانی کے ذریعہ پیش ہوا ہے لیکن اس کے پس منظر میں گنگا جمنی تہذیب کو پیش کرنے کی عمدہ کوشش ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ احمد رشید کے فکشن کا ایک خاص ڈکشن ہے اور موضوع کے ساتھ ٹریٹمنٹ کا اپنا ایک خاص انداز ہے جسے وہ علامات، استعارات اور تشبیہات کے ذریعے بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ان کی کہانی ایک ہی قرأت میں ختم کرنے کا تقاضا کرتی ہے، ورنہ کہانی کا سرا ذہن سے پھسل جاتا ہے اور قاری، کہانی میں استعمال شدہ علائم سے پوری طرح واقف نہیں ہوسکتا۔ یہی ان کے افسانوں کا فنی اختصاص ہے۔

ooo

ابتدا کی طرف واپسی

میت کی تجہیز و تکفین کے بعد، دعاے مغفرت ہوئی۔ آہستہ آہستہ لوگ واپس ہو گئے کہ واپسی ان کا مقدر ہے۔ قبرستان میں سناٹا پھیل گیا۔ درختوں کے درمیان سے نکل کر سر پر تیز دھوپ کا بوجھ لیے اپنے بوجھل قدموں کو دھیرے دھیرے سمیٹتے ہوئے قبرستان کے دروازے پر آ گیا۔ سر کو ہاتھوں کی رحل میں رکھے تین سیڑھیوں والے زینہ کے آخری پائیدان پر پریشان حال بیٹھ گیا۔ چہرے کے ورق ورق پر چنتا درج ہے دونوں آنکھوں میں آنسو رکھے ہیں۔ کائنات کی بے ثباتی اور زندگی کے عارضی ہونے کے احساس سے حیران و پریشان ہو کر وہ سوچنے لگا سب بیکار ہے۔ کائنات بے حقیقت اور حیات بے معنی۔ سب فانی، باقی ہے صرف ذات اللہ کی۔ اچانک آہٹ ہوئی، سر اُٹھایا، آنکھیں وا کیں، سامنے کھڑی پُرنور شخصیت کو اپنی نگاہوں کے دائرے میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایک سفید ریش انسان، رنگ برف کی مانند، چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی کی سرخی کے درمیان سیاہ گول نشان، جنت نشاں، سفید برّاق لباس، کرتا گھٹنوں سے نیچا، پائجامہ ٹخنوں سے اونچا، کُرتے کی جیب سے مسواک کا سر جھانک رہا ہے:

> ''تمہارے غم زدہ ہونے کا مجھے کوئی غم نہیں، کیوں کہ
> راستہ گھر کو گیا ہے اسی ویرانے سے، انسان کو گود میں بھی
> گور کی یاد رہنی چاہیے۔ گورستان کی وحشت یاد رکھنے سے

موت کی دہشت ختم ہوتی ہے۔''

اس کے گوش میں نور کی بوندیں ٹپکاتے ہوئے بزرگ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، ایک نور کی لکیر برق رفتاری سے اس کی آنکھوں میں داخل ہوئی جسم کی تمام شریانوں میں دوڑ دھیا لہر کی طرح پھیل گئی۔ اس روشنی میں اس نے اپنی زندگی کے اندھیروں کا احتساب کیا۔ دل بے چین، قلب بے سکون ہوا۔ وہ سبک سبک رونے لگا... آنسوؤں کے راستے سیاہی رفتہ رفتہ زائل ہوئی۔ وہ اُٹھا، بزرگ نے کمر پر دائیں ہاتھ رکھا ان کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے نظر جھکائے چلنے لگا۔ اچانک دھیان آیا وہ جھٹکے کے ساتھ بزرگ کے بائیں جانب آ گیا۔ راہ گیروں سے بے خبر وہ نہایت خاموشی سے باادب چل رہا ہے۔

بزرگ گویا ہوئے ''میزان حقوق العباد پر بنے گی اور تمہاری آزمائش حقوق اللہ میں ہے۔ خدمتِ خلق کائنات کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ کتاب وسنت کی اتباع میں اللہ کی رضا ہے۔ ہر باطن، جس کا ظاہر مخالف ہے باطل ہے۔ ذکر وفکر اور شکر فصل کو وصل میں بدلنے کا راستہ ہے۔''

شراب طہورہ میں اس کا روم روم ڈوب گیا۔ اس کی آنکھیں نشہ کی کیفیت سے بند ہوگئیں جب کھلیں تو گھر کے دروازے پر تنہا کھڑا تھا..... کیا تھا؟..... کیا ہوا؟..... خواب تھا؟..... حقیقت تھی!..... غم تھا نہ خوشی۔ بس ایک ناقابلِ بیان سرور کا احساس باقی تھا۔

گھر میں داخل ہوا۔ بوسیدہ دیواریں چڑیلوں کی طرح کالے کالے دانت نکالے، خوف ناک قہقہے لگا رہی ہیں، برسوں سے ان میں ٹیپ بھری گئی اور نہ مرمت ہوئی۔ قلعی ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیڑھ یا دو فٹا پتلے زینے کی نو سیڑھیاں چڑھ کر چھ بائی نو کا چھوٹا سا کمرہ جو مہمان خانہ بھی ہے، میں چار بائی چھ کے ایک تخت پر پرانا سا بستر بچھا ہے جس پر بوڑھے والد عمر تقریباً اسّی سال لیٹے بیٹھے، سوتے جاگتے، نماز و تسبیح پڑھتے رہتے

ہیں۔ کھانا پینا، چیخ و پکار، سخت کلامی اسی تخت پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔ اب بھی تخت پر بیٹھے تسبیح کے دانے اُلٹ رہے ہیں۔

''السلام علیکم'' اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری والدین کو مسرور نگاہوں سے دیکھنے سے ایک مقبول حج کا ثواب ملتا ہے اور جتنی بار دیکھا جائے گا۔ اتنے ہی مقبول حجوں کا ثواب ملے گا۔

''وعلیکم السلام'' اپنی گدیلی سی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں جو کبرسنی کی وجہ سے خرگوش کی طرح چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی ہیں۔

''بڑی دیر لگادی، کہاں گئے تھے؟' ابّا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''میرے ایک دوست کا انتقال ہوگیا۔ رات کے آخری حصہ میں بے چینی ہوئی، دل گھبرایا، ہارٹ اٹیک ہوا، موت واقعہ ہوگئی، فرسٹ ایڈ کی بھی مہلت نہیں ملی۔'' اس نے آہستہ آہستہ روداد سنائی جس کے ایک ایک لفظ سے درد ٹپک رہا ہے۔

بوڑھا شخص خاموش بیٹھا اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے ہیں۔....

''کیوں روتا ہے؟ اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔'' اچانک باریش بزرگ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے، امّی کی تلاش میں ادھر اُدھر آنکھیں چلائیں۔ دوسرے کمرے کے دائیں جانب دروازے پر نظر ڈالی۔ اسٹوو کی سَن سَن میں روٹی پکنے کی پھٹ پھٹ کی آواز دب رہی ہے۔ کمزوری اور بیماری کی وجہ غریبی ہے، حالاں کہ بوڑھا ہونے کے لیے ساٹھ سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ مگر وہ کیا کرے؟ جو نصیب میں لکھا ہے وہی تو ہو رہا ہے۔ اگر دولت صرف محنت سے ملتی تو ہر مزدور دولت مند ہوتا۔ دولت کا تعلق قسمت سے جڑا ہے..... وہ سوچتا ہے اماں کو کھانسی کا ٹھسکا، ابّا کو استھما۔ جب انھیں پھندا

لگتا، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے..... چہرہ انگارے جیسا سرخ، آنکھوں سے سرخی مائل پانی، سینہ پر دونوں ہاتھ رکھے جیسے دل کو دبانے یا روکنے کی ناکام کوشش کے اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں..... اس کے علاوہ چارہ کیا ہے، سوائے صبر و شکر کے؟ وہ والدین کی خدمت میں حاضر باش رہتا۔ باپ باب الفردوس، ماں کے پیروں تلے جنت، مسلمان کے لیے یہی تحفۂ آخرت بھی ہے۔

پڑوسیوں کا خیال رکھنا، مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آنا، پنج گانہ نماز با جماعت خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا اس کی زندگی کا معمول تھا لیکن باریش بزرگ کے دیدار کے بعد معمولات نے عادت کی صورت اختیار کر لی جس میں خلوصِ نیت اور خشیت بھی شامل ہو گئی ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے بے چینی کی شدت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ شب بیداری نیند سے راضی بارضا کا معاملہ ہوتا ہے، یہاں تو نیند پر شب خوں راضی بے رضا کا سلسلہ سا بن گیا ہے۔ ان دنوں چین کے ساتھ نیند بھی کھو گئی ہے۔

''بیٹا اُٹھ جا، اذان ہونے والی ہے۔'' اماں نے آواز لگائی۔

''میں جاگ رہا ہوں۔'' وہ اُٹھا..... جاڑوں کی آدھی رات گزر چکی ہے، وضو کیا، تہجد پڑھی۔ ابھی فجر ہونے میں چار گھنٹے باقی ہیں۔ اماں کو بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے نیند نہیں آتی، اُٹھا کر خود سو گئی، چڑیا جیسی نیند اور جگار..... ابا جاگتے زیادہ ہیں، زیادہ کھانسی یا دماغی خشکی کی وجہ سے۔ لیکن یہاں نہ بڑھاپا ہے، نہ کھانسی نہ دماغی کمزوری۔ بستر پر لیٹے ہوئے بھی ذہن جاگتا ہے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھا رہا..... تلاوتِ قرآن کرتا رہا... یادِ الٰہی میں مصروف رہا۔ فجر کی اذان ہوئی..... باجماعت نماز پڑھنے کے لیے مسجد دوڑ لگائی..... اشراق کی نماز ادا کر کے گھر واپس ہوا۔ اماں دسترخوان لگائے انتظار کر رہی ہے۔ خشک بیسنی روٹی ایک چھوٹی سی تھالی میں رکھی ہے..... دو پیالیوں میں چائے سے بھاپ نکل رہی ہے۔

''بیٹا تجھے پسند ہے! بیسنی روٹی خستہ ہوتی ہے آسانی سے چبنے میں آجاتی

ہے..... تیرے ابا کا بھی اسی سے پیٹ بھر جاتا ہے۔'' اماں نے دھیرے دھیرے بات کہی۔

وہ اماں کی باتوں کو خوش اخلاقی سے سن رہا ہے۔ سوچ رہا ہے بیسنی روٹی مجھے اصلی گھی میں تر پسند ہے... لیکن اصلی گھی مہنگائی کی وجہ سے نصیب کہاں! بچپن سے مزدوری کی، ابا بھی مزدوری کرتے تھے دونوں کی کمائی ملا کر گھی جیسی جنس میسر آتی۔ پھر اماں اور ابا کے دانت کہاں جو گیہوں کی روٹی چبا سکیں۔ ہر دن بیسنی روٹی پسند اور ناپسند کے دائرے میں نہیں آتی..... بلکہ یہ تو مجبوری ہے..... اور..... مجبوری بندہ کا مقدر اور مختاری تو اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اماں ابا کے ساتھ کھانا نہیں کھاتی چوں کہ ابا کھانے میں کھانستے زیادہ ہیں۔ اماں کو کراہیت ہوتی ہے۔ ہاں مجھ اور خود سے پہلے کھانا اور ناشتہ ابا کو پہلے سجاتی۔ یہ اس کی شوہر پرستی کی دلیل ہے بھلے ہی شوہر پسندی نہ ہو چوں کہ جوان بیٹے کے سامنے باپ دوئم درجہ کی چیز ہو جاتی ہے۔

''کھا بیٹا..... روٹی ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

''ہاں.....'' اس نے آدھی روٹی کھا کر چائے پی لی۔

اماں خاموشی سے گردن جھکائے سوچ رہی ہے۔ عبدالحنان کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ کم بولتا ہے، اگر اس کے ابا بولیں تو بھی مختصر جواب پھر خاموشی۔ میں بولوں ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اور ''ہاں ہوں'' مختصر جواب کے بعد خاموشی۔ اس قدر خاموشی سے گھر میں قبرستان جیسی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ رات رات بھر جاگتا رہتا ہے، جانے کیا کیا سوچتا ہے؟ وہ سمجھتا ہے اماں سوتی ہے لیکن اماں کروٹیں بدلتی ہے۔ اس کے ابا کو بھی یہ معلوم ہے کہتے ہیں ''اب ہمارا بیٹا بہت کم بولتا ہے پہلے ٹکر ٹکر بولتا تھا۔ جب ٹوکا جاتا تھا تب ہی خاموش ہوتا تھا...'' میں نے بوڑھی ہو کر ڈیڑھ روٹی کھائی اور وہ آدھی روٹی کھا کر دسترخوان سے اُٹھ گیا۔ مجھے اپنے بڑھاپے پر غیرت آئی کہ وہ جوانی میں کم کھاتا ہے..... میں نے اپنی

اس تشویش کا اظہار اس کے ابا سے کیا۔ انھوں نے کہا تمھیں بات کرنا مجھے ٹھکا آتا ہے، بات کرنے میں دقّت ہوتی ہے۔

اترتی سردی کی کھلتی ہوئی رات ہے۔ آسمان پر مسکراتے ہوئے ستارے رقص و سرود میں مست ہیں... خنک ہوا، سبک خرامی سے موسم کی خوش گواری میں اضافہ کر رہی ہے۔ آنگن میں بچھی چارپائی پر چت لیٹا عبدالحنان جھلملاتے آسمان کو آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش میں مگن ہے۔

''بیٹا۔''

''جی اماں۔''

''میرا بڈھا پاہے..... اب کھانا مجھ سے بنتا نہیں ہے، ایک بہو لے آ۔''

اس کا چہرہ فق پڑ گیا..... کچھ بات نہیں بنی..... منمنا کر رہ گیا اور ہونقوں کی طرح ماں کو دیکھنے لگا۔

''میرے کام میں ہاتھ بٹائے گی..... گھر میں رونق آجائے گی۔''

''اس عمر میں تم اتنا کام کرتی ہو۔ مجھے احساس ہے..... مگر ماں میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا..... (چند لمحے توقف کے بعد) عبدالمنان کی کر دو۔''

''وہ ابھی چھوٹا ہے..... پھر یوں تھوڑی ہوتا ہے کہ چھوٹا بھائی کی شادی ہو جائے اور بڑا بیٹھا رہے۔''

اس طرح کی ٹوکا ٹاکی کرنا اماں کا معمول بن گیا تھا۔ وہ سوچتا ہے ادھر تو اماں کا بڈھا پا اوپر سے بے حد کمزوری..... ابا کی حالت بھی قابلِ رحم ہے..... اپنی بیماری کی وجہ سے اماں کی مدد بھی نہیں کر پاتے..... سانس ان کو چین نہیں لینے دیتی۔ سانس کا ہونا، سانس کا لینا، زندگی کی علامت ہے..... لیکن ابا کے لیے موت کی علامت بن گیا ہے..... لے۔ کن..... لیکن موت تو حقیقت ہے، مالکِ حقیقی سے ملاقات کرنے کا ایک سفر..... اور سفر

انسان کی تقدیر ہے..... کائنات میں آنا، کائنات سے جانا..... ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا سفر..... تلاش، جستجو، آرزو سب ہی سفر ہی کے دوسرے نام ہیں..... اور ایک رات کے آخری حصہ میں وہ ایک سفر میں نامعلوم منزل کی تلاش میں نکل پڑا..... چلتے چلتے چاروں طرف اندھیرے میں گونجتی ہوئی..... چُر، چُر..... پھٹ پھٹ..... بگ ٹٹ..... کی آوازوں کے درمیان سے چپکے چپکے صبح بتدریج نمودار ہوئی..... جنگل کے بیچ سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی کے دونوں اطراف اُگے گھنے درختوں کے، چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرنوں سے کبھی کبھی آنکھیں چکاچوند ہو جاتیں..... پرندوں کے چہچہانے کی سریلی سُر تال اس کے کانوں میں رس سا گھول رہی ہیں۔ ان کے رسیلے گیتوں میں تقدیس و تہلیل کی خوشبو سے اس کا ذہن معطر ہو رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں انسان کی ناشکری پر اظہارِ تاسّف کرتا ہے کہ رب العالمین کی توصیف بیان کرنے اور ثنا خوانی کرنے میں لاپرواہی برتتا ہے۔

چلتے چلتے شہر سے بہت دور نکل آیا ہے۔ دھوپ چاروں اطراف پھیل چکی ہے۔ پگڈنڈی سے جڑی ہوئی کالی سڑک کے دونوں اطراف لق دق میدان میں دور دور اکا دُکا شیشم کے درخت نظر آتے ہیں۔ ایک پُلیا جس کے نیچے سے چوڑی نالی نکل رہی ہے، جو ن کی گرمی سے سوکھ چکی ہے۔ سرخ مٹی کی چٹختی ہوئی پپڑیاں پانی کی جگہ جم گئی ہیں۔ برسات میں نالا بھر کر چلتا ہے تو راہ گیروں کے لیے یہ پُلیا بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے..... لیکن زیادہ بارش ہونے سے پانی اس کے اوپر بہنے لگتا ہے اور دور دور تک سڑک بھی پانی کے نیچے غائب ہو جاتی ہے۔ وہ تھکا ماندہ اس پُلیا پر سر جھکائے بیٹھ گیا۔ اچانک کوئی سایہ اس کے اوپر آ کر گرا، کانوں میں آہٹ سی ہوئی اس نے چونک کر دیکھا کہ وہی باریش بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔

''یا ارحم الراحمین کی ذات اقدس سے مایوس ہونا کفر ہے۔''

''جی..... بزرگ'' اس نے چونک کر کہا۔

''خداوند تعالیٰ اس کو دوست رکھتا ہے، جس میں دریا جیسی سخاوت، آفتاب کی سی شفقت اور زمین کے مانند ضیافت ہو۔''

''جی.....'' وہ نیچی نگاہ کیے باادب کھڑا رہا۔

''فکر و عمل کے درمیان فاصلہ توڑنا ہے۔ عیب اپنے، نیکی دوسری کی دیکھنا ہے۔ نفس موٹا ہوتا ہے تو روح کمزور ہوتی ہے۔ سامنے کی حقیقت بھی خلاف شریعت ہو قبول نہ ہوگی۔ خارقِ عادت شے شریعت کی استقامت پر گواہ نہ ہو تو وہ مکر و فریب ہوگا۔ ظاہری طہارت بغیر باطنی طہارت کے منافقت ہے۔''

''بزرگ میرے سینہ میں آگ سی جلتی ہے لیکن میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے..... آنکھوں کو کچھ بجھائی نہیں دیتا۔'' اس نے اپنی افسردگی کا اظہار کیا۔

''اس آگ کو بجھنے نہیں دیتا..... اسی کی روشنی میں صراطِ مستقیم تلاش کرو۔'' بزرگ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

ایک روشنی کی لکیر اس کے جسم میں سرایت کر گئی..... اس کے سحر اور سرور میں وہ ڈوب گیا جب آنکھ کھلی سامنے سے بزرگ غائب ہو گئے۔

گرمی سخت ہے، تپش کی شدت سے پسینہ میں شرابور وہ جانبِ منزل گامزن ہے۔ نئی توانائی کے ساتھ نہ تکان، نہ تھکن بس لگن اور جب لگاؤ ہوتا ہے تو کانٹے دار کمبل کی طرح دھوپ بھی مخملی چادر میں بدل جاتی ہے۔ وہ تیز قدموں سے سڑک پر چل رہا ہے، سامنے سے لال مٹی کی آندھی تیز رفتاری سے اس کے اوپر سخت دباؤ بنا رہی ہے۔ اس میں دھکا سا لگتا، کپڑوں کو سمیٹتا ہوا سنسان راستے سے گزر رہا ہے..... دائیں ہاتھ پر قبرستان میں ہُو کا سا عالم ہے۔ اس کے آخری سرے پر پیاؤ کے برابر سے پہاڑ کی اونچائی کے لیے ایک چوڑا راستہ لال پتھروں سے پختہ کر دیا گیا ہے۔ چوٹی پر شاہ ابدال بابا جو پہاڑ بابا کے نام سے

مشہور ہیں، کے مزار شریف پر زائرین کی بھیڑ جمعرات کی فاتحہ خوانی کے لیے جمع ہے۔ باہر دروازے سے پانچ گز دور پیاؤ کے قریب وضوخانہ پر لوگ ٹھنڈا پانی پی رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مزار کے اندر داخل ہونے کے لیے تین فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا دروازہ ہے۔ لوگ دروازے سے جُھک کر نکلتے ہیں کہ کہیں ماتھا دہلیز سے نہ ٹکرا جائے۔ آنکھوں کے سامنے پہاڑ والے بابا کا مزار شریف ہے۔ بھیڑ جب کم ہوئی وہ بھی پوری احتیاط سے اندر داخل ہوا ''السلام علیکم یا اہلِ القبور'' منہ ہی منہ میں کہا۔ اور شیشم کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر خاموشی سے نظارہ دیکھنے لگا۔ عصر و مغرب کے درمیان چڑھتا سورج مغرب میں اُتر رہا ہے، اس کے چاروں طرف خون کی سرخی پھیل رہی ہے..... عورتیں اور مرد ایک پلیٹ میں گلاب اور گیندے کی پنکھڑیاں ایک ہاتھ میں بتاشوں کی پڑیا لیے سر جھکائے مزار شریف جا رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ماتھا ٹیکتے، مزار کے گرد چکر لگاتے۔ مجاور جو مزار کے قریب ستون سے کمر لگائے بیٹھا پھولوں کی پلیٹ اور بتاشوں کی تھیلی ہاتھ میں لیتا اور ایک کنستر میں ڈال لیتا۔ ہر شخص فاتحہ خوانی کر کے بڑے احترام سے مزار کی جانب چہرا کیے، کمر کی طرف سے سیڑھیوں سے اُتر جاتا۔ اگر بتی اور لوبان کا دھواں مزار کے چاروں طرف پھیل رہا ہے، مجاور مور پنکھ جھاڑو زائرین کے چہروں پر مارتا۔ کبھی کبھی مزار شریف کے اوپر بڑے احترام سے لہراتا، ''آگے بڑھو..... جلدی کرو کی آواز'' لگاتا..... تھوڑی دیر بعد مجمع ہلکا ہو گیا۔ مجاور بتاشے اور پھولوں کی ڈلیا لے کر چلا گیا۔ مزار کی سلطنت میں سناٹے کی حکومت قائم ہو گئی..... اللہ ہو، اللہ ہو کی آوازوں سے سناٹا سحر انگیز ہو رہا ہے۔ پُر اسرار ماحول چاروں طرف طاری ہے۔ وہ ابھی تک گھنے درخت کی شاخ پکڑے خاموش کھڑا ہے۔ سامنے سبز لباس میں ملبوس شیخ ''خانقاہ تمہاری کائنات ہے اس کے باہر جھانکا تو بھٹک جاؤ گے'' کو دیکھ کر چونک گیا..... شیخ نے بنا بولے اس کا بایاں ہاتھ اپنے داہنے ہاتھ میں لیا اور بایاں ہاتھ پشت پر رکھے۔

دھیرے دھیرے قدم دائیں جانب شانِ بے نیازی سے آگے بڑھائے اور ایک حجرے میں داخل ہوتے ہوئے ''دنیا سے دشمنی گوشہ نشینی، مردم بے زاری، قربتِ الٰہی کے لیے ضروری ہے'' سرگوشی کی۔

حجرے کا منظر پُراسرار سناٹے میں ڈوبا ہوا ہے۔ پکی چھت کے نیچے چار ستونوں کے نیچے مریدین درجہ بندی کے لحاظ سے دنیا مافیہا سے بے خبر اپنے اپنے ''مرحلہ'' میں غرق آنکھیں بند کیے ہیں۔ اوّل ستون سے کمر لگائے ''ذکر بالجہر'' قلب کی جانب ضرب کے ساتھ جاری ہے۔

''قلب پر ضرب لگاتے ہوئے پوری قوت لگانی چاہیے تاکہ قلب اس کا اثر محسوس کرے اور ذہن کو یکسوئی حاصل ہو۔ یہاں ایسا عالم محسوس ہو کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز نہ مطلوب ہے، نہ محبوب، شیخ نے آہستہ سے کہا۔

اس کی نگاہ دوسرے ستون کی جانب گئی۔

شیخ نے کہا ''ذکرِ خفی۔ پہلے مرحلہ میں عشق الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اُٹھے گی..... یہاں زبان خاموش ہو جائے گی۔ دنیا سے کلیتاً بے رغبت ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں مستغرق ہو جائے گا۔''

اس نے دیکھا سالک پر محویت کا عالم طاری ہے۔

''یہ مقام فنا کی ابتدا ہے جیسے جیسے سالک مراقبے میں پیش رفت کرے گا کیفیت کا اعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔'' شیخ گویا ہوئے۔

اس کی حیران اور ششدر نگاہ تیسرے ستون پر گئی ایک مرید کائنات اور کائنات کی ہر شے سے بے خبر ہوش وادراک سے دور، آنکھیں بند کیے مراقبہ کی حالت میں ہے۔

''یہ سکر کی کیفیت..... سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا'' اشارتاً شیخ نے کہا۔

وہ نہایت سنجیدگی سے جذب وکیف کے عالم کو دیکھ رہا ہے..... اس کی آنکھیں

آنسوؤں میں ڈوب گئیں، تھوڑی ہی دیر میں زار و قطار آنسو بہنے لگے۔

بزرگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا..... ''خاموش رہنا، غم واندوہ میں ہونا، ایک راستہ ہے سلوک کا۔ سالک کی آخری منزل حالتِ صحو ہے یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر عمل اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ حق تعالیٰ ہی اپنی قوت و جبروت سے اس کو بھی بخشتا ہے۔''

یہ کہہ کر شیخ مراقبہ میں چلے گئے۔ حجرہ میں خاموشی چھا گئی فقط اللہ ہُو کا منظر طاری ہو گیا۔ چاروں طرف روشنی کی لکیریں تانے بانے کی مانند بُن گئیں۔

وہ سلوک کے پہلے مرحلہ کے لیے ذکر بالجہر میں شب و روز پوری ترتیب اور ضابطہ کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ دو مہینہ کے عرصہ میں روزانہ چار ہزار ورود کے بعد ذہن اللہ تعالیٰ پر مرکوز ہوا اور عشقِ الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اُٹھی۔ اس کمال کے حاصل ہو جانے پر ذکرِ خفی ''اللہ سمیع''، ''اللہ بصیر'' اور ''اللہ علیم'' الفاظ کو عرشِ الٰہی سے کھینچ کر دماغ میں، پھر قلب اور پھر ناف میں، ذکر نفی و اثبات کے ساتھ کیا۔ زبان خاموش ہو گئی لوگوں سے میل جول ترک، دنیا سے بے رغبت ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں مستغرق ہونے پر اس نے اپنے کو فانی محسوس کیا، اسے لگا راکھ کے ڈھیر کو ہوائیں اڑائے دے رہی ہیں، کائنات کی ہر چیز پارہ پارہ ہو گئی ہیں، صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات موجود ہے..... کائنات کی ہر شے فانی باقی ذات صرف اللہ کی۔ سلوک کی دوسری منزل میں کثرت کے تمام جلوے یک لخت مٹ گئے، عقل کھو گئی، حیران و پریشان، کائنات کی کسی چیز کا ہوش نہیں رہا اور نہ اپنی ذات کا۔ اس کو سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا..... اس پر سُکر کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب سُکر سے اصل حالت کی طرف واپس ہوا تو اس نے خدا اور بندے کے درمیان فرق کی طرف مراجعت کی، اسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی پہاڑ کے اوپر چڑھ کر نیچے گر پڑے۔

اب وہ حالتِ صحو میں آ گیا ہے، اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے

قبضے میں ہے۔حق تعالیٰ ہی قوت عطا کرتا ہے اور وہی اس کے تمام افعال واحوال کو اپنے علم اور ارادے کے مطابق وجود عطا کرتا ہے۔

جب وہ اسرارِ الٰہی کا راز دار اور انوارِ الٰہی سے منور ہوا، شیخ نے خصوصی نظر کرم کی۔ اس کا دائیں ہاتھ پکڑ کر اوپر کی طرف اُٹھایا اور آسمان کی طرف اشارہ کیا ''کیا دیکھتا ہے؟''

''اب تو یہ عالم ہے کہ عرش اور حجاب عظمت تک کی چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آنکھوں کے سامنے کوئی پردہ ہی نہیں۔'' اس نے محویت کے عالم میں کہا۔

شیخ نے سبز رنگ کا لباس پہنوایا، خرقہ خلافت سے سرفراز کیا۔'اس شخص کو جوانی میں مقتدایان کامل کا مقام بلند حاصل ہو گیا۔''

حلقہ میں بیٹھے تمام مریدین کے چہروں پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

''خلافت کا عمر سے کوئی تعلق نہیں، یہ سعادت، ریاضت اور عبادت سے ملتی ہے۔'' شیخ نے کہا۔

فوراً سمع کی محفل کا اہتمام ہوا۔حمد اور نعت کی گونج میں ماحول ڈوب گیا۔خوش گلو شخص کی پُر درد اور پُر سوز آواز سے ''حال'' کی کیفیت طاری ہو گئی۔

چند لمحے بعد، چنگ ورباب اور مردنگ کی تھاپ پر جب قوالیوں کا دور شروع ہوا تو وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔اچانک اس کے منہ سے نکلا ''سماع میں ذوق، دردِ دل اور سوزِ قلب سے ہوتا ہے، نہ کہ مزامیر سے۔'' نظر اُٹھائی دیکھا شیخ غیر حاضر تھے۔

اس نے مریدوں سے کہا ''خلافِ شرع ہے'' کہہ کر اُٹھ گیا..... اور مزار شریف سے باہر نکل کر قصد سفر کیا اور جنگل کی جانب چل دیا۔

سڑک درمیان میں پل صراط کی طرح پڑی ہے، بائیں جانب چٹیل میدان پر آگ برس رہی ہے، سورج سوا نیزے پر اُتر آیا ہے اور سرخ مٹی شعلے اُگل رہی ہے۔ چاروں طرف مٹی کے غبار مٹی کی طرح اڑتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ دائیں جانب طویل

القامت درخت صف باندھے کھڑے ہیں۔ پستہ قد رکوع میں جھکے ہیں، خنک ہوا شانِ بے نیازی سے پیر و مرشد کی طرح چل رہی ہے۔ اسے کاروبار زندگی سے کوئی مطلب نہیں، نہ دنیا سے کچھ لینا دینا۔ فقط نیک چلنی سے چلنا ہے کبھی شدہ شدہ روی سے کبھی تیز قدموں سے۔ چھوٹے چھوٹے پودے ہوا کے دباؤ سے سر بہ سجود ہیں۔ برگ و بار جھوم جھوم کر درود و سلام پڑھ رہے ہیں۔ ایک عجیب و غریب کیف و سرور کا منظر ہے۔ اس نے نظر اُٹھائی، دور پہاڑ کی اودی چوٹی پر نیلی چادر کی اونچائی کوہساروں کی تنی ہوئی گردن کا غرور چکنا چور کر رہی ہے۔ عرش بریں کے سامنے آسمان گردن جھکائے دست بستہ کھڑا ہے۔ درختوں کے درمیان ایک خانقاہ کے پیچھے وسیع و عریض نہر دیکھی جس میں اشیا کی صورتیں سایوں کی طرح نظر آ رہی ہیں اور اس میں نئی نئی موجیں اُٹھ اُٹھ کر انوارِ الٰہی کے نغمے گنگنا رہی ہیں۔ اس نے خوش نما منظر کا خوب لطف اُٹھایا۔ جب اس پر سحر اور سرور کی کیفیت طاری ہوئی، سامنے باریش بزرگ اپنی خانقاہ میں مراقبہ کی حالت میں ہیں وہ دوزانو، ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ جب باریش بزرگ بیدار ہوئے ان کی نظر کیمیا اثر اس پر پڑی اور یوں مخاطب ہوئے۔

''عقل مند کون ہے؟'' بزرگ نے پوچھا۔

''دنیا کو ترک کرنے والا۔''

''بزرگ کون ہے؟''

''جو کسی چیز سے متغیر نہ ہو۔''

''دولت مند کون ہے؟''

''قناعت کرنے والا۔''

''محتاج کون ہے؟''

''قناعت نہ کرنے والا۔''

''اس کائنات کو بے ثبات جان، جان کو بے جان، حیات عارضی، ذاتِ الٰہی باقی

ہے۔'' اس نے خاموشی سے گردن ہلائی۔

''تارک الدنیا ہونا، رہبانیت اختیار کرنا، دوسرے ادیان کی پیروی ہے ورنہ اسی دنیا میں تقویٰ کے ساتھ رہ کر دنیا سے بے رغبت رہنا اصل صوفی کا مسلک ہے۔

''جی۔''

''حیات و کائنات، تہذیب و تمدن، آفتاب و مہتاب، ستارے و سیارے سب ابتدا کی طرف واپس ہو رہے ہیں۔''

''ابھی دو دن ہی گزرے ہیں کہ روحانی لذت و حلاوت دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔'' اس نے بزرگ سے کہا۔

''جنگل میں رہنے کے بجائے مخلوق خدا کے درمیان میں رہ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت بنائے۔ انشاء اللہ تم ایسا درخت ہو گے جس کے سایہ میں مخلوق خدا آرام پائے گی اور فیض پائے گی۔ تم مجاہدہ برابر کرتے رہنا، اس سے غافل نہ ہونا۔'' باریش بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس نے گھر کی واپسی کے لیے قصد سفر باندھا۔ نئی صبح کا سورج اندھیرے کی چادر پھاڑ کر طلوع ہو رہا ہے اور سارا منظر انوارِ الٰہی میں ڈوب رہا ہے۔

ooo

بھورے سید کا بھوت

یہی کوئی دس سال کی عمر ہوگی، جمعرات کی شام تھی، امی نے چراغ جلایا۔ اگر بتیاں سلگائیں اس طاق دیوار کے سوراخ میں اڑس دیں، جس کے چھوٹے سے دروازے پر گوٹا ٹکا سبز ریشمین کپڑے کا پردہ ٹنگا تھا جہاں دکھائی کچھ نہیں دیتا لیکن گھر کے سب ہی بزرگ کہتے تھے کہ اس میں سید بابا رہتے ہیں۔ یہ معمول برسوں سے چلا آرہا تھا کہ اگر گھر میں کوئی آفتِ ناگہانی آجاتی تو ہفتہ واری عمل روزانہ میں تبدیل ہو جاتا اور اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ آفت سے نجات نہیں مل جاتی، پھر ایک نئے سبز رنگ کا پردہ سیا جاتا اور پرانا بدل دیا جاتا۔ ایک جمعرات کو امی اگر بتی جلانا بھول گئیں اور مجھے بہرا بھوت بخار چڑھا۔ رات کو عجیب عجیب طرح کے خواب دکھائی دیئے۔ ایک مکروہ صورت بڈھیا جس کے چہرے پر سلوٹیں، گال پچکے ہوئے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ میرے سرہانے بیٹھ جاتی اور میری گردن کو پوری طاقت سے دباتی، میں چھڑا کر زینے کی جانب بھاگتا۔

بڈھیا مجھے اپنی تیز رفتاری سے دبوچ لیتی، پورے مکان میں چوہے بلی کا یہ کھیل چلتا۔ خوف کے سبب پسینہ میں شرابور ہو جاتا۔ اس کی گرفت سے نکلنا میرے لئے محال ہو جاتا، یہاں تک کہ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی، قریب سوئی ہوئی امی چونک کر جاگ جاتی اور مجھے ہلا جھلا کر اٹھا کر بیٹھاتی..... جلد از جلد پانی کا گلاس لاتی اور کہتی ''کیا ہوا؟''..... میں خواب کی تفصیل سناتا..... وہ مجھے سمجھاتی ''ڈرو نہیں بیٹا..... سید بابا کوئی بھی شکل اختیار

کر سکتے ہیں''۔آخر کار کافی انتظار کے بعد جمعرات آئی، اگر بتیاں جلائی گئیں۔ بتاشوں پر فاتحہ لگی اور بخار اتر گیا۔کم عمری کمزوری کا نام ہے اس لئے حفاظتی امور کا بڑھ جانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ چار دہائیوں قبل انسانوں کی آبادی کم تھی اور بھوتوں کی تعداد زیادہ۔ جوں جوں آبادی بڑھی، بھوتوں نے شہر چھوڑ کر سنسان علاقوں کو اپنی قیام گاہ بنالیا ہے۔ یہ باریک بات میرے اب سمجھ میں آئی ہے کہ جب سے انسان بھوت ہو گئے ہیں، بھوتوں نے سنسان علاقے چھوڑ دیئے ہیں۔اس لئے وارداتیں بڑھ گئیں ہیں انسان کے خوفناک ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ واردات کرتے وقت، آبادی میں بھی نہیں چوکتا۔

اس وقت میرے بزرگوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ انسانوں سے خطرات بڑھنے کے امکانات قوی ہیں۔ جب بھی خوف کا ذکر ہوا تو انہوں نے سورج طلوع وغروب ہونے، سورج کے نصف النہار ہونے اور نصف رات کے بعد بھورے سید والی گلی سے گزرنے پر پابندی لگادی چونکہ وہاں بدروحیں رہتی ہیں۔ بھورے سید مسلمانوں کا قبرستان ہے جو پاک روحوں کی آبادگاہ ہے۔ بدروح وہی بنتی ہے جو انسان حالتِ ناپاکی میں مرے۔ مسلمان استنجا کرتا ہے۔سنت طریقے سے غسل کرتا ہے، ہر وقت پاک رہتا ہے پھر بھی نجس حالت میں مر جائے تو گندی روح آسمان کی جانب دوڑ لگاتی ہے اور فرشتوں کے کوڑے کھاتی ہے۔ میں سوچتا بھورے سید کا قبرستان بدروحوں کا مسکن کیوں کر بن گیا۔؟

''بار بار موت کو یاد کرنے کا ذکر، قبرستان میں دعا درود پڑھنے کا حکم کیوں ہے؟'' عہد طفلی میں سوال کیا

''سوالات کم کیا کرو؟'' ایسا امی نے بولا

میں خاموش ہو گیا۔اس بات کی مکمل احتیاط رکھی کہ ضروری کام کی وجہ سے بھی اس راستے سے کبھی نہیں گزرا کیونکہ بھوت قبرستان میں ہو یا نہ ہو لیکن میرے دل پر ضرور بیٹھ

گیا تھا جو اکثر و بیشتر کسی نہ کسی موقع پر دل سے باہر نکل کر میرے چاروں طرف منڈلانے لگتا اور اس وقت تک غائب نہ ہوتا جب تک کہ طاق کے گدی نشین سید بابا کی فاتحہ خوانی ہو کر بچوں میں شیرینی تقسیم نہیں ہوتی۔

چار دہائی قبل، چاروں اطراف لق و دق میدان تھے، کھیت تھے مکان کی چھت سے اوپر کوٹ میں واقع جامع مسجد آسانی سے نظر آتی تھی، گھر کا نوکر بارہ دری بازار سے سودا سلف لینے جاتا دادی دور تک نظر رکھتی، مجال نہیں کہ نوکر اپنے فرائض سے لاپرواہی کرے۔ بھورے سید کے قریب وسیع و عریض میدان تھا۔ میدان میں ہڈی کا گودام، ہڈی کا گودام نیم کے درختوں سے ڈھکا تھا۔ حمید صاحب کے نزدیک لحیم شحیم نیم کے درخت پر اکثر مغرب کے آس پاس اور شب و روز کے بارہ بجے کے درمیان چھم چھم چھم چھن چھن چھن کی آواز آتی تھی۔ مذکورہ اوقات میں بچوں کی مجال کیا بڑے بھی گزرنے سے ڈرتے تھے..... حیرت انگیز امر یہ ہے کہ آواز سب ہی کو سنائی دیتی تھی لیکن دکھائی صرف ان کو دیتی جن پر وہ عورت سوار ہو جاتی تھی۔ بزرگوں نے بتایا نیم کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سے کٹھریا میں ایک مہتر اور مہترانی کافی عرصہ سے رہ رہے تھے محلے کی خدمت گزاری کے عیوض رہنے کے لئے جگہ دیدی گئی تھی..... ویسے بھی نیچ ذات کو کون منہہ لگاتا ہے؟ یہ بدنصیب لوگ، گوشت خوری کی نسبت سے یا مسلمان گندی قوم کہلانے کی وجہ سے کثیر مسلم علاقوں میں ہی ملیں گے خیر وجہ جو بھی ہو بہر حال وہ جوڑا بہت خوش و خرم تھا۔ عورت خوبصورت ہو تو مہترانی بھی رانی ہو جاتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے رادھے شیام گپتا جی جو چھوت چھات کے بے حد قائل تھے۔ پیاز کے چھلکوں پر دھرم بھرشٹ ہو جاتا تھا مگر مہترانی ان کے دل کی مہارانی تھی۔ ایک رات کے اندھیرے میں لوگوں نے ان کو اس حالت میں پکڑا تھا۔ جہاں مرد اور عورت کے درمیان جنس اور جسم کا فرق مٹ جاتا ہے۔ دن میں گپتا جی کے چھونے کی، بات دور کی سایہ پڑنے سے بھی آپوتر ہو جانے پر اشنان کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن اچانک سوبر (ڈلیوری)

کی حالت میں زچہ بچہ دونوں ہی مر گئے..... گویا ناپاکی کی حالت میں وہ آنجہانی ہوگئی اور آخر کار وہ گندی روح، چڑیل بن گئی جو دیکھنے میں مہترانی کی طرح خوبصورت تھی، میٹھی میٹھی باتوں میں پھسلا کر انسانوں سے خصوصی طور سے مردوں سے اپنے پرانے حساب چکاتی۔ لوگ کہتے ہیں چونکہ اس کے خوبصورت جسم پر مردوں نے بدصورت نگاہیں ڈالی ہیں، اپنے بستر گرم کئے ہیں اس لئے ایک ایک لمحہ کا بدلہ لینے کے لئے وہ درخت سے اترتی ہے۔ آج تک میری یہ سمجھ میں نہیں آیا معاملہ جب راضی بارضا کا ہوتا تو بدلہ لینے کی کیا تک ہے؟ اسمیں مردوں کا کیا قصور؟ مگر قصور تو اس عورت کا بھی نہیں چونکہ جوانی اور خوبصورتی کا امتزاج ایک ایسا طوفان برپا کرتا ہے کہ انسانی قدریں اور مذہبی دیواریں سب ٹوٹ جاتی ہیں۔ مردوں کو جب کوئی خوبصورت عورت رجھاتی ہے تو وہ عورت کے پیروں کو نہیں دیکھتا کہ وہ پیچھے مڑے ہیں، یا پیٹ کی جانب مڑے ہیں بہکے قدم سے کیا لینا دینا عورت تو پھر عورت ہے۔

نیم کے درخت کی شاخیں حمید صاحب کے مکان کی طرف جھکی تھیں، چڑیل کا سایہ ہونے کے سبب مرد نکمے ہوگئے، گھر میں لڑکیاں کیا جوان ہوئیں، چڑیل کا شکنجہ کس گیا۔ آئے دن دورے پڑنا اس گھر کا معمول بن گیا تھا۔ شب و روز کے درمیان کسی بھی وقت ''ہائے ہائے'' کی آوازیں دیواریں پھوڑ کر کانوں میں داخل ہونے کے لوگ عادی ہو گئے تھے۔ چڑیل کیا چاہتی تھی، کسی کو پتہ نہیں تھا۔

ایک روز حمید صاحب کی بڑی بیٹی کو بیہوشی کا شدید دورہ پڑا..... ''ہائے ہائے آئیں آئیں..... ہائے ہائے'' کی دردانگیز صدائیں آرہی تھیں۔ ان کے گھر میں خاندان اور محلے والوں کا ہجوم تھا۔ کمرے میں پٹ لیٹی سدھ بدھ کھوئے ہوئے تھی، بال بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی قاری صاحب کے بیٹے عبدالرحمٰن گدی نشین کسی سریع الاثر عمل کا ورد کر رہے تھے۔ استاد کی اجازت سے وظائف اور عملیات پر مکمل عبور حاصل کرنے کے

بعد۔اس پیشہ میں مہارت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی، جس طرح استاد کے حجرہ میں بیماروں کی بھیڑ رہتی تھی اسی طرح عبدالرحمٰن کے کمرے میں جماؤ رہتا۔قاری صاحب نے عبدالرحمٰن کو بیٹے کی طرح پالا تھا زندگی بھر استقرارِ حمل کے تعویز دیتے رہے لیکن برائے امساک خود کو کوئی تعویز کارگر ثابت نہیں ہوا یہ مشہور ہے کہ کوئی ڈاکٹر اپنا علاج نہیں کرسکتا کچھ ایسا ہی حال بزرگ قاری صاحب کا تھا۔مولوی عبدالرحمٰن کی بزرگی کا کارنامہ دیگر لوگوں کی طرح میں بھی کمرے کے باہر حواس باختہ سن رہا تھا۔

''کون ہو تم؟''

''میں.....م.....یں.....دلاری ہوں''منمانے کی آواز

''کہاں سے آئی ہے''

''ہڈی کے گودام سے''

قریب بیٹھے ایک شخص نے دوسرے کے کان میں آہستہ سے کہا''بڑے پہونچے ہوئے ہیں.....''

''میں نے سنا ہے کہ رات کے بارہ بجے کے بعد شاہ جمال کے قبرستان جا کر ہفت پیکر کا برسوں وِرد کر کے موکل قبضہ میں کیا ہے''دوسرے شخص نے جواب دیا

''جاتی کیوں نہیں''چیخنے کی آواز

''نہیں جاؤں گی.....یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے''منمانے کی آواز

''تو عورت ہو کر،عورت سے عشق کرتی ہے، بے حیا.....بے شرم''

مرد بھی تو مرد سے عشق کرتے ہیں''منمانے کی آواز

''تجھے کوئی حق نہیں؟''

''انسانوں کو حق ہے''؟استفہامیہ انداز

یہاں مولوی صاحب چاروں خانے چت دکھائی دیئے، آواز میں لکنت تھی،

گھگھیاتے ہوئے بڑے مشکل سے بولے، ''تو کیوں ستا رہی ہے''۔

''جب انسان انسان کو ستاتے ہیں، تو دنیا تماشہ دیکھتی ہے'' منمانے کی آواز

انسانی تہذیب پر یہ کاری ضرب مجھے برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا منظر وہی تھا مولوی صاحب زبان زد وظیفہ پڑھ پڑھ کر ہاتھوں پر پھونکتے اور سر سے کمر، کمر سے پیروں تک ہاتھ پھیرتے۔ لڑکی کبھی کبھی گردن اٹھا کر بولتی اور ٹھوڑی زمین پر رکھ دیتی..... تھک جاتی تو چت لیٹ جاتی..... ہائے ہائے کی آواز سے کمرا بدستور گونج رہا تھا..... ہائے ہائے بند ہونے پر خاموشی طاری ہو جاتی۔ کم عمر میں اس قدر خوفناک منظر کو دیکھنا مرے لئے نا قابل برداشت تھا۔ پتہ نہیں میرے جسم کے کون سے حصہ میں گدگدی کا احساس ہو رہا تھا؟ یہ گدگدی بھی بڑے ہی عجیب شے کا نام ہے، زندگی ایک معمہ ہے تو گدگدی بھی ناقبل بیان دیوانہ کا خواب ہوتی ہے۔ لیکن چڑیل بھوت اور آسیب کی بھی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ ان کے اتحاد کا اس سے بڑا نمونہ اور کیا ہوگا کہ یہ مخلوق آپس میں کبھی نہیں لڑتی، ان میں اتفاق ہوتا ہے نہ کینہ وحسد۔ ان کی کائنات میں اصلاح کے لئے نہ کوئی مسیحا آیا، نہ مدر ٹریسا اور نہ ہی کوئی امن کا دیوتا سوائے سلیمان علیہ السلام کے۔ اور انسانوں کی اصلاح کے لئے آدم علیہ السلام سے پیارے نبی تک لاکھوں نبیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

تین دہائی قبل، میں جوان ہو گیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومنا، موج و مستی کرنا، ہواؤں میں اُڑنا، لڑکیوں کو تاکنا، خواب وخیال کی دنیا سجانا۔ اب رات میں کوئی مکروہ صورت عورت نہیں ڈراتی تھی، لیکن خواب میں خوبصورت لڑکیاں آتی تھیں، یہ خواب جاگتی آنکھوں کے تھے، یہ خواب سوتی آنکھوں کے تھے۔ فکر اور عشق جیسے امراض راتوں کی نیند چھین لیتے ہیں۔ ایک رات اپنی محبوبہ سے ملاقات کر کے امیر نشان سے آ رہا تھا..... عشق کی عظمت اور قوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ امی کی سخت ہدایت کے باوجود بھی رات میں لال ڈگی

روڈ سے گزرنا عشق کی مجبوری تھی، جہاں نٹ رہتا تھا جو صرف مردوں کو پریشان کرتا تھا۔ چونکہ عشق بھی ایک بھوت ہوتا ہے جب وہ سر چڑھ کر بولتا ہے تو اس کی تپش سے آہنی دیواریں بھی سیال ہو جاتی ہیں۔ رات سنسان اور بھیانک تھی۔ لال ڈگی سڑک کالے اژدھے کے مانند پڑی تھی، سخت سردی سے سڑک کے دونوں کنارے پر کھڑے درخت آسمان پر لگے ستاروں کی طرح ٹھٹر رہے تھے جب ستارے ٹھٹرتے ہیں تو تقدیر بھی سکڑ جاتی ہے۔ سڑک کے دائیں طرف گڈھے میں بھرا پانی سنگھاڑوں کی بیلوں سے سیاہ مائل ہو رہا تھا۔ اسی جانب تانگہ کے قریب ایک شخص کالا کمبل اوڑھے سردی سے سکڑ رہا تھا

''تانگہ خالی ہے''

''ہاں بابو جی..... بیٹھو''

تانگہ سڑک پر دوڑنے لگا..... کھٹ کھٹ بگ ٹٹ پگ ٹٹ کی آوازیں خاموشی کو توڑ رہی تھیں منظر کی خوفناکی وصل محبوب کے سرور میں دھندلی ہو گئی اچانک عشق کا طلسم اس وقت ٹوٹ گیا جب کوچوان کے بائیں ہاتھ پر نظر گئی جسمیں لگام تھی۔ عجیب بھیانک ہاتھ جس پر بڑے بڑے بال اگے ہوئے تھے سیاہ ہاتھ پر لمبے لمبے ناخون

''یہ کیا''؟ اچانک میرے زبان سے نکلا

کوچوان نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا کمبل اتر چکا تھا..... لمبوترہ چہرہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، دانت بڑے بڑے، اس مکروہ چہرے کو دیکھ میں خوف زدہ ہو کر بیہوش ہو گیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں کہاں چل رہا ہوں؟ کس طرح گھر آیا؟..... سخت ترین بخار میں مبتلا ہو گیا، دہشت زدہ چہرہ زرد پڑ گیا..... جسم لاغر ہو گیا۔، ڈاکٹر اور حکیم کو دکھایا، جوں جوں علاج ہوا، مرض بڑھتا گیا..... سب جتن کر لئے گئے مگر افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار شہر کے مشہور اور قیمتی ڈاکٹر سمیع حمید کو دکھایا گیا۔ بڑے دلچسپ اور پُر مذاق انسان تھے، اندازِ گفتگو ایسا کہ مرض آدھا رہ جائے۔ نہایت زندہ دل اور بے تکلف تھے۔ شراب کے بے حد شوقین تھے،

مشہور تھا کہ بغیر پیئے مریض کو دیکھتے نہ ہی آپریشن کرتے ان کے پیشے کے ساتھ شراب ایسے گھل مل گئی تھی کہ مریضوں کو ان کے پیشہ پر اسی وقت اعتبار ہوتا جب وہ نشہ میں ہوتے۔

''بہت دن کے بعد آئے'' انہوں نے اس انداز سے کہا جیسے کوئی پرانی آشنائی ہو۔

''ڈاکٹر صاحب، کتنے ہی ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھادیا'' والد صاحب نے کہا

تو مرض بڑھا کر آئے ہو'' ڈاکٹر صاحب نے نبض ہاتھ میں لی اور میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے 'مولوی' سیانا، پنڈت کو بھی دکھایا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا'' والد صاحب نے اپنی مایوسی کا اظہار کیا

''گھبرایئے نہیں، مرض کا علاج ڈاکٹروں کے پاس ہوتا ہے''

''ڈاکٹر صاحب جب ہر طرف سے مایوسی ہوتی ہے تب ہی انسان فلیتے اور تعویزوں پر یقین کرتا ہے''

''اس کے بعد خدا یاد آتا ہے'' ڈاکٹر صاحب مسکرائے

''لال ڈگی کا میں ہی تو نٹ ہوں'' یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اتنا زور سے ہنسے کہ مطب گونج گیا

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیوں مذاق کر رہے ہیں آپ؟'' والد صاحب نے انکساری سے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے، جب انسان پر دولت کمانے کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ خود بھوت بن جاتا ہے'' ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے یقین دہانی کرائی

ڈاکٹر صاحب کی گفتگو ان کے مزاج کے عین مطابق تھی اس لئے ہمارے لئے قابل یقین نہیں تھی چونکہ بہت سے امراض کے علاج انسان کی نفسیات سے جُڑے ہوتے ہیں۔ شائد اسی لئے انہوں نے اپنے نٹ ہونے کا اقرار کیا۔ بہر حال میرا علاج ہوا اور مجھے

شفا ہوئی اور یہ شفا میرے نصیب میں تھی یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھی۔ امی نے سید بابا کے سامنے منت بولی تھی تین جمعراتوں کو حلوے پر فاتحہ لگی اور اگربتی متواتر ہر روز جلی۔ سید بابا کے سامنے ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ سید بابا خدا کے نیک بندے اور ڈاکٹر صاحب ایک دنیا دار انسان، اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ سید بابا کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ عام خیال یہ تھا کہ سید بابا نے ایک ہفتہ کے اندر روبہ صحت کر دیا..... ان کی عظمت پر اعتماد پختہ تر ہو گیا۔

اب سے دو دو ہائی قبل میری عمر تقریباً تیس سال کی ہوگی۔ شادی، تعلیم، مشاہدہ اور تجربوں نے سوچ و فکر میں سنجیدگی پیدا کر دی تھی۔ میں نائٹ شو دیکھ کر بھورے سید والی سڑک سے لوٹ رہا تھا۔ جیسے ہی سبزی فروش والی مسجد عبور کی قبرستان کی سرحد میں داخل ہوا۔ عجیب ہو کا عالم تھا۔ چاروں طرف سناٹے کو میرے قدموں کی چاپ توڑ رہی تھی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی تعاقب کر رہا ہو۔ مڑ کر دیکھا دور تک سڑک کالے بھوت کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ آدم نہ آدم زاد۔ دو فرلانگ لمبی سڑک کی مسافت اسقدر طویل ہو گئی تھی کہ پیروں میں سمٹنا مشکل ہو گئی تھی۔ قدم بہت بھاری ہو گئے تھے۔ اچانک کھڑ کھڑ کھڑ کی آواز آئی..... چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ بائیں جانب گوتم تیاگی اسکول کے آہنی گیٹ پر نظر گئی وہ ہل رہا تھا..... کھٹک کی آواز سے سناٹا ٹوٹ گیا۔ ایک اینٹ اتنی زور سے گری کہ میں خوف زدہ ہو گیا۔ شاید بلی کودی ہو..... قدموں کی آواز پر کتے بھونکنے لگے..... سنسان سڑک کے خاموش منظر کو کھڑ کھڑ ڑ ڑ اور بھوں بھوں اوں اوں کی آوازوں نے بہت خوفناک بنا دیا تھا..... دائیں جانب قبرستان میں اگے پیپل کے درخت سے چُھن چُھن چُھن کی آواز نے چونکا دیا..... سوچنے لگا چڑیل ہڈی والے گودام میں نیم کے درخت پر رہتی ہے..... یہاں کیسے آ گئی؟ چند لمحے میں چھن چھن کی آواز کو پھڑ پھڑاہٹ نے چاٹ لیا۔ پرندے ادھر سے ادھر اڑ رہے تھے۔ خوف میرے جسم میں سرایت کر گیا تھا۔ بدن میں

کپکپاہٹ پیدا ہوگئی۔ سخت سردی پڑنے کے باوجود پسینہ کی بوندیں پیشانی اور مونچھوں پر ابھر آئیں..... میں گھبرایا ہوا سڑک پر چل رہا تھا۔

اچانک میری نظر دُور سامنے گئی ایک کالا سایہ جس کی لمبائی تقریباً چالیس گز ہوگی یہ حساب میں نے اس طرح لگایا کہ مرحوم عبدالاحد کے مکان سے شروع ہو کر رشید ٹھیکیدار کے کارخانہ تک ختم ہو رہا تھا..... وہ سایہ آگے کی جانب جُھکا..... اس کی لمبائی سکڑ گئی..... اس کا دایاں ہاتھ مڑا..... اچانک ہاتھ کا سایہ کی لمبائی پھر بڑھ گئی..... ہاتھ میں کوئی بھاری پتھر سا محسوس ہوا..... خوف اور سردی سے جسم پر لرزہ طاری تھا..... چُرمُر..... چُرمُر..... کی آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا..... لال ڈگی کانٹ سرپٹ سرپٹ پیچھا کر رہا تھا۔ پیپل کے درخت سے چھن چھن کی آواز میرا تعاقب کر رہی تھی۔ ہڈی والے گودام کی چڑیل میری پشت پر منمنا رہی تھی۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی، کلیجہ منہہ کو آرہا تھا۔ بھاگنے کی کوشش کی لیکن قدم بھاری ہو گئے تھے۔ سامنے نظر گئی وہ کالا سایہ نالی کے قریب کھڑا تھا اس کے دونوں ہاتھ ستر پر رکھے تھے..... اچانک سایہ اسقدر سکڑ گیا جیسے غایب ہو رہا ہو۔ ایسے بھیانک منظر کو دیکھ کر حافظہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے..... بہت کوشش کے بعد یاد آیا پیارے حبیب پر جب سخت جادو کر دیا گیا تھا تو معوذتین نازل ہوئی تھیں۔ میں نے زور زور سے وِرد شروع کر دیا..... اس کی برکت سے سایہ وہیں جامد وساکت کھڑا ہو گیا..... قدم تیزی سے پوری کوشش کے ساتھ آگے بڑھائے..... قبرستان پیچھے رہ گیا اور مرحوم عبدالاحد کے مکان سے دس قدم پیچھے ہی تھا۔

''بشیر صاحب اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہیں'' فضا میں ایک آواز گونجی خوف کی وجہ سے میری گھِی گھِی بن گئی۔ چاروں طرف نظر دوڑائی جواب دینے کے بجائے میرے اوپر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

وہ سایہ دو قدم آگے بڑھا..... میرے شانہ کو زور سے حرکت دی ''کہاں کھو گئے

میں آپ ہی سے پوچھ رہا ہوں''

''ہوں''میں نے چونک کر دیکھا''ارے سعید صاحب آپ ہیں''

''ہاں، پیشاب کرنے آیا تھا.....آپ کو دیکھ کر رُک گیا''

ایک ہی لمحہ میں وہ خوفناک منظر میری نگاہوں سے غائب ہو گیا اور سوچنے لگا ڈاکٹر سمیع حمید کے مرنے کے بعد لال ڈگی کانٹ بھی مر گیا تھا۔

ooo

دوسال بعد

سورج جونیزوں کی نوکوں پر کھڑا ہوکر اعلان کرتا ہے کہ پوری کائنات کوجلا کر ہی دم لوں گا۔ ہوا بھی یوں ہی آسمان اور زمین بھی سرخ ہوکر جب کالی ہوگئی تو وہ خود بھی جل کر سیاہ مائل ہوگیا۔ آسمان میں ستارے خاک میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح چمک رہے تھے لیکن رنگ ۔او۔بیل (Ring-O-Bell) ہوٹل روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی ٹھنڈی روشنی ہوٹل میں بیٹھے لوگوں کوگرما رہی تھی ٹیبل اور چیرس کے درمیانی گیلریوں میں نیتا ادھر ادھر اسٹرپ کر رہی تھی۔ اس کے جسم کی تھرک کے ساتھ دیکھنے والوں کی گردنیں بھی تھرک رہی تھیں اور میزوں کے نیچے رکھے ہوئے تقریباً تمام پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ ہر آنکھ اس کے کولھو اور پستانوں پر رکھی تھیں اور وہ ان سب کا بوجھ اٹھائے بڑی مستی میں رقص کر رہی تھی۔ جیسے ہی ٹیوب لائٹ اور بلبوں نے اپنے اپنے چہروں پر نقاب ڈالے ہوٹل میں سب نے سنا ''کم آن ایور بڈی'' (Come on every body)۔ سب لوگ کرسی اور میزوں کے درمیان سے نکل چکے تھے۔ ہال کے اندھیرے کو سانسوں کی گرمی پگھلا رہی تھی۔ اور جب اندھیرا پگھل چکا تو لوگوں نے جسموں کی بو محسوس کی... لڑکیوں کے ہونٹوں کی ہلکی ہوتی ہوئی لپ اِسٹک دیکھی ۔ کچھ مرد اپنی گردن ، کچھ اپنے ہونٹ ، کچھ اپنے رخساروں کو رومال سے رگڑ رہے تھے۔ اور وہ تنہا ریسٹورینٹ کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے سرد ہونٹوں پر لپ اسٹک ابھی گہری تھی۔

''ہیوآئی ڈرنک(Have I drink)''۔

بائیں میز پر بیٹھے نوجوان نے پیگ بنایا''اوہویس(Oh...Yes)''

لڑکی نے پیگ غٹ غٹ پی لیا...اور میز کے دوسری طرف بیٹھ کر اس کے ہاتھ سے سگریٹ لی ایک کش لے کر اس کے چہرے پر دھواں پھینک دیا۔نوجوان نے اپنی آنکھوں کو بار بار بند کیا اور کھول دیا دونوں آنکھیں جن میں نشہ قید تھا... پانی بھر گیا۔

''اوہ ساری(Oh,Sorry) شاید آنکھوں میں دھواں لگ گیا''لڑکی نے اس کے چہرے کے چاروں طرف ہاتھ ہلانا شروع کر دیا اور اس کے بائیں ہاتھ کو اپنی مٹھی میں دبا کر''چلو، باہر بیٹھیں گے... یہاں درمیان میں میز...اور شور ہے اور مجھے دیوار سے نفرت ہے''

نوجوان اٹھا...دونوں باہر لان میں آ گئے

''آؤ...اشوک کے درخت کے نیچے سمنٹ کی کرسی پر بیٹھیں گے''

لڑکے نے اشارہ کیا

''نہیں''

''کیوں''

''اشوک،سکندر،اکبر یہ سب دکتیٹر تھے''

''تمہیں ہسٹری سے دلچسپی ہے''نوجوان کا استفہامیہ انداز

''ہاں ہسٹری میرا سبجیکٹ رہا ہے مگر بڑا بورنگ ...مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے کہ زندگی بھر طوائفوں جیسی زندگی گزارتے ہیں...اور بڑھاپے میں رامائن کا پاٹھ کرتے ہیں ض''لڑکی نے کہا

''ہاں اپنے آپ کو دہراتے ہیں''نوجوان نے گردن ہلائی۔

''میں نہیں چاہتی کہ میں بھی اتہاس کا کوئی سیاہ پنّا بن کر دیمک کی خوراک

بنوں...اس نے سوئٹر کے اوپر کے دو بٹن کھولتے ہوئے نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

نوجوان نے دونوں بٹنوں کو لگایا اسکی چھنگلی انگلیاں لڑکی کی گردن کو چھو گئیں اور انگوٹھے گردن کے نیچے مس کر گئے...''سردی پڑ رہی ہے...دیکھو ستارے بھی ٹھٹر رہے ہیں'' نوجوان نے آسمان کی طرف اشارہ کیا

لڑکی نے نوجوان کی آنکھوں کا تعاقب کیا''نہیں...سو رہے ہیں۔اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے''میری ہتھیلیاں جل رہی ہیں...اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ اپنے دائیں رخسار پر رکھ لیا۔اس کے سرخ رخسار دہک رہے تھے۔لان میں سردی پڑ رہی تھی...اشوک کے پتے سُکڑ رہے تھے اور ٹیوب لائٹ ٹھٹھر رہی تھی۔اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو بھر لیا اور اس کے ہونٹوں کا،اس کی ٹھوڑی کے درمیانی دائرے کا اور اس کی گردن کا کس (Kiss) کیا۔لڑکی اس کی باہوں میں سمٹ گئی۔بالوں میں بندھا رِبن جو نیلے رنگ کا تھا نیچے گر گیا۔لڑکی انتظار کرنے لگی

نوجوان نے اس کو اٹھایا اور اس کی گردن میں ڈال کر اپنی جانب جھٹکا دیا''میں تمہیں ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے...وہ کیا کہے گا؟''

''ہاں...کبھی کبھی گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے...میں نے پہلی بار،پہلا گھونٹ،پہلا کش لیا...ا...و...ر.....پہلا....

''....کس (Kiss) کیا'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''تمہاری آنکھیں بڑی گہری ہیں''

''مجھے معلوم ہے۔وہ بھی یہی کہتا تھا۔یہ ادیب اور شاعر بھی مجھے بہت بُرے لگتے ہیں۔یہ جب بھی بات کرتے ہیں...صرف مردوں کی کرتے ہیں...کبھی وہ ہمارے اندر

بھی اترتے ہیں؟''

''وہ لڑکا بہت شریف ہے'' نوجوان نے کہا

''اس لیے تو مجھے اچھا نہیں لگتا''

''اچھا نہیں لگتا'' نوجوان نے تعجب کا اظہار کیا

''ہاں... ہاں اچھا ہے... اسی لیے میری چغلی کھائے گا میرے بیوروکریٹ باپ سے''

''بٹ آئی ایم ناٹ اے گڈ مین'' (but, I am not a good man)''

''سو آئی لائک یو مین (so, I like you man)... وہ لوگ جو سمندر کیکنارے بیٹھ کر لہروں کا کھیل صرف آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مجھے اچھے نہیں لگتے''

''مطلب'' نوجوان نے چونکتے ہوئے پوچھا

''جبکہ میرے آنکھیں جھیل جیسی گہری ہیں... اس نے کہا تھا۔ تو پھر نہ ڈوبنے کی وجہ۔''

نوجوان مسکرایا... لڑکی بھی مسکرائی ''ذرا سوچو وہ میری آنکھوں میں خواب سجانے کی بھی بات کرتا ہے.... اور یہ بھی کہتا ہے تمہاری آنکھیں جھیل کی طرح گہری ہیں... تو پھر خواب ڈوب نہیں جائیں گے؟''

نوجوان نے قہقہہ لگایا ''ہاں خواب تو۔ پھر خواب ہوتے ہیں''

''کیا کہتا ہے تمہارا بیوروکریٹ باپ؟'' نوجوان نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا

''وہ کہتے ہیں زندگی تمہاری ہے. مگر سانسیں ہماری ہیں... اگر بٹوارہ ہوا تو میرا جسم تو میرا ہی ہوانا... تم سمجھ رہے ہو نا''

''وہ لڑکا میرے بارے میں سوچے گا؟''

''وہ تم سے نفرت کر رہا ہوگا'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا

''وہ لڑکا سے نفرت کر رہا ہوگا'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا

''یہ اسی کا حق ہے۔ کیوں کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے''

لڑکی کو ہنسی آ گئی... نوجوان نے بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا

لڑکی کے بال اس کی گردن پر رقص کرنے لگے ... بالوں سے پرفیوم کی خوشبو پھوٹنے لگی۔ نوجوان نے اپنی ناک اس کے بالوں پر رکھ دی... لڑکی نے اپنی پیشانی نوجوان کی پیشانی پر رکھ دی

''لڑکا اور کیا کہتا ہے؟''

''لڑکا نہ اپنے بارے میں کچھ کہتا ہے... نہ ہی میرے بارے میں... کچھ کہتا ہے تو صرف کیٹس کے بارے میں... شیلے کو پسند کرتا ہے... اور کہتا ہے ٹیگور کی گیتا نجلی''... ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ'' دونوں عظیم کتابیں ہیں''

''یہ کیٹس نے کہا تھا نہ بیوٹی اِز ٹو سی، ناٹ ٹو ٹچ (Beauty is to see not to touch) نوجوان نے کہا

''ہاں اچاریہ رجنیش نے کچھ اسی انداز میں دوسری بات کہی ہے'' انسان جسموں سے گزر کر ہی ابدی حُسن تک پہنچتا ہے... تب ہی انسان اور بھگوان کے درمیان کوئی انتر نہیں رہ پاتا....

''اچاریہ رجنیش تمہیں متاثر کرتا ہے'' نوجوان کا استفہامیہ انداز

''لڑکا جینس ہے''

''جینس تو فرائڈ بھی تھا اور اس سے پہلے واتسائن بھی... میرا جی بھی کم جینس نہیں تھے''

نوجوان مسکرایا'' تم فہرست غلط بنا رہی ہو۔ کارل مارکس نے پیٹ تک کی بات کہی ہے۔ اور پیٹ کے بعد کی بات فرائڈ نے کہی ہے... ایم آئی رانگ (Am I

wrong)''نوجوان نے کہا

'اوہ نو ڈارلنگ یو آر آبسیولیٹلی رائٹ (Oh no, darling, you are absolutely Right) اس طرح انسان کی تھیوری مکمل ہوگئی۔اب کائنات کو تیسرے جینیس کی کوئی ضرورت نہیں۔اور میرا بیوروکریٹ باپ تیسرا جینیس منوانے پر تُلا ہوا ہے'' لڑکی نے غصّہ میں کہا۔اور کہہ کر خاموش ہوگئی ... چاروں طرف نظر ڈالی ...خاموشی پَر پھیلائے تھی...اس نے نوجوان کی خاموش آنکھوں میں جھانکا۔''تم ہر درجہ میں فرسٹ پاس ہونے کی محنت کرو''لڑکی بولی

''اگر فرسٹ پاس ہوتا تو میں ایک اچھا انسان ہوتا...تھوڑی دیر وقفہ کے بعد۔ میرا گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے''

''میرا بیوروکریٹ باپ کہتا ہے''وہ لڑکا ہمیشہ فرسٹ آتا ہے۔یقیناً کسی دن افسر بنے گا۔یعنی بیوروکریٹ...اینڈ آئی ہیٹ نپولین،ہٹلر،مسولینی۔۔۔۔''لڑکی نے نوجوان کے قہقہہ کا ساتھ دیا...دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا...اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ دور تک ابدی حسن کی تلاش میں نکل گئے ... جہاں بھگوان حسن ہوتا ہے...کائنات حسن ہوتی ہے...اور بھگوان اور انسان میں کوئی انتر نہیں ہوتا...انسان بھگوان ہوتا ہے...انسان حسن ہوتا...صرف انسان...حسن...حسن...انسان...حسن.....

نوجوان دو سال بعد ہندوستان واپس ہو رہا تھا۔اپنے دیش کی سوندھی سوندھی مٹی کی سُگندھ کے احساس سے ذہن ایک عجیب طرح کی فرحت و تازگی محسوس کر رہا تھا۔وہ زیرِلب مسکرایا اور سامان پیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔میز پر رکھی ہوئی البم پر نظر گئی جس میں جرمنی کے خوبصورت لمحات قید تھے۔باتھنگ کاسٹیوم میں ملبوس دوشیزہ کے ہاتھ پاؤں پر انگلی پھیری...جو چکنے اور دبیز تھے اسے لگا جیسے تصویر مسکرانے لگی...''تم انڈیا جا رہا ہے''

''یس'' دوروز قبل اس نے کہا تھا

''ام بی چلے گا'' دوشیزہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بولنے لگی تھی

''تمہاری آنکھیں سمندر کی طرح نیلی اور گہری ہیں'' اس نے گفتگو کا پہلو بدلا

''تم نے سائنٹ سے مرتا آدمی دیکھا...ام نے دیکھا...اس کا پور باڈی نیلا پڑ جاتا ہے''

''میں مایوسی پسند نہیں کرتا۔ زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو خوشی ...چاہے وہ ایک لمحہ کی ہو''

''ام نے تمہارے ساتھ بوت ٹائم ویسٹ کیا''

''نو ڈارلنگ قیمتی بنایا''

دوشیزہ مسکرائی۔ اور پھر اتنے زور سے ہنسی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں

''ڈونٹ بی سیڈ...انٹرٹین دی لائف (Don`t be sad Darling, entertain the life)'' اس نے دوشیزہ کو گلے سے لگایا اور اس کی کمر تھپتھپائی۔

نوجوان نے البم بند کی اور اسے بیگ میں رکھا...آنسوؤں کے دو قطرے اس کی آنکھوں میں آ گئے۔ اچانک بھیگی ہوئی نگاہیں کریم کلر کے سوئٹر پر مرکوز ہو گئیں اسے یاد ہے ہندوستان چھوڑتے وقت وہی لڑکی اسے ایر پورٹ سی آف کرنے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔۔۔اور میری ماں تو بے حال تھی...'' بیٹے یہ سوئٹر اسی لڑکی نے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے، تمہارے لیے'' ماں نے زور دے کر کہا

میں نے اسی وقت سوئٹر پہن لیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا...خالی خالی آنکھوں میں سینکڑوں خواب نظر آئے... چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے...بھیگی ہوئی آنکھوں میں سرخ ڈورے بن گئے تھے۔ میں سوچنے لگا شاید سوئی نہیں۔ شاید روئی ہو۔ ممکن ہے شراب کا گھونٹ بھر لیا ہو۔ یا کوئی ایسی بے خودی ہو جس کا اظہار عورت زبان سے کم، آنکھوں

سے زیادہ کرتی ہے"

"میں جلد لوٹ آؤں گا" ماحول کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا

"میں انتظار کروں گی" لڑکی نے چونکتے ہوئے کہا۔ اور پیٹ پر سوئٹر کی چٹکی بھرتے ہوئے کہا "اسی کو پہن کر ہندوستان واپس لوٹو گے"

نوجوان نے دوبارہ بیگ کھولا۔ کپڑے الٹ پلٹ کیے۔ سوئٹر اس سے آنکھ مچولی کرنے لگا۔ اس نے اپنے بدن پر نظر ڈالی... سوچنے لگا سوئٹر چھوٹا ہو گیا۔ سوئٹر اٹھایا گلے میں باندھ لیا ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی "وہاں کا وہیں چھوڑ کر آنا"... یہ خیال آتے ہی اسے ہنسی آ گئی... "جسم میرا فربہ ہو گیا ہے لایا کمزور تھا"....اپنے آپ سے کہا

وفا اور جفا کی بحث سے ذہن کو جھٹکا....اسے یاد آیا ایر پورٹ سے جہاز نے جب اڑان بھری تھی۔ لڑکی ہاتھ ہلا رہی تھی آسمان کی جانب اڑان بھرتے جہاز پر نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔....نظر کی حد ختم ہونے تک ہاتھ سائے کی طرح ہو کر غائب ہو گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

میں اس وقت ان آنسوؤں کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا.....اور نہ ہی اس دو سال کے عرصہ میں مجھے اس بارے میں کوئی خیال آیا۔ اور اب دو سال کے بعد میں نے اس کریم کلر کے سوئٹر کو گلے میں کیوں باندھ لیا ہے....کیوں؟

اچانک اس کی آمد پر دالان میں بیٹھی ہوئی اس کی ماں چونک گئی...اور دیکھتی رہ گئی ....زبان گنگ ہو گئی....جہاں بیٹھی رہ گئی...رفتہ رفتہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے پھیلنے لگی جیسے خاموش سمندر پہ کوئی معمولی سی لہر کروٹ لیتی ہے... ماں بڑی نقاہت سے اٹھی بیٹے کی پیشانی کو چوما...نوجوان نے ماں کو سینے سے لگا لیا...ماں کے چہرے پر پڑی ہوئی جھریاں عمر کے ماہ و سال کا شمار کر رہی تھیں۔ مگر ماں کی عمر ہی کیا ہے؟ صرف دو سال پہلے ماں اتنی بوڑھی

نہیں تھی۔اس کی انگلیاں بالوں کو کریدنے لگیں سینکڑوں چاندی کے تار اسے نظر آئے۔اس نے ماں کا چہرہ اوپر اٹھایا...آنکھوں میں آنسو تھے...انگوٹھوں کے پوروں سے آنسو صاف کئے اور چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی...چند لمحے خاموشی رہی۔ماں نے نظر بھر کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا جب سوئٹر کی آستینوں پر نظر گئی جو گلے کے سامنے لٹک رہی تھی۔

''بیٹے اکیلے ہی آئے ہو'' ماں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا

''ہاں...ماں...'' چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے'' ماں تم نے کہا تھا اپنے دیش کی مٹی بڑی سوندھی ہے اس کی سُگندھ یاد رکھنا...لیکن چند روز پہلے' خط میں لکھا تھا...'' اکیلے مت آنا...ایسا کیوں لکھا.....؟''

ماں نے نظریں چُراتے ہوئے کہا'' ہاں بیٹے عورت مرد کے بغیر بڑی کمزور ہوتی ہے...تم بہت چھوٹے تھے جب تمہارے باپ مجھے چھوڑ گئے...ان کے بعد ٹوٹ گئی تھی میں....اب جبکہ تم پورے مرد ہو گئے ہو...تو میں تم کو اپنی طاقت سمجھتی ہوں....جب تم چلے گئے تھے....تو میں اکیلی پڑ گئی تھی...کمزور ہو گئی تھی...جب انسان کی طاقت چلی جاتی ہے...تو بات کا وزن بھی گھٹ جاتا ہے'' ماں نے سرد آہ بھری

چند لمحہ ماں اٹھی اور کچن سے چائے بنا کر لائی اور میز پر رکھ دی...اس میں سے بھاپ نکل کر ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنا رہی تھی ... بیٹے ٹھنڈی ہو جائے گی''...میری طرف بڑے غور سے دیکھا...گلوگیر آواز میں بولی'' اس ایک جینیس لڑکے سے شادی کر لی'' آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑ لگ گئی۔

نوجوان ماں کے آنسوؤں کی طرف توجہ کئے بغیر ہنسا...زور زور سے ہنسنے لگا اس کے قہقہوں کی گونج میں ماں کی رندھی ہوئی آواز، ماں کی روتی ہوئی آنکھیں اور ماحول کی ناخوشگواری ڈوب گئی...اور جب وہ اُبھرا تو سوچنے لگا...'' میں نے دو سال کے عرصہ میں،

ہندوستان کی تیس سالہ زندگی سے کہیں زیادہ عشق کیے ہیں....لیکن یہ بات میں ماں کو کیسے سمجھاؤں عورت کمزور نہیں ہوتی بلکہ مرد کی شکتی ہوتی ہے...برہما کی شکتی سچی، وشنو کی طاقت لکشمی، شنکر کی قوت پاروتی....''

''ماں'' اس نے حواس درست کرتے ہوئے کہا

''ہاں'' ماں نے چونکتے ہوئے کہا

''اس میں رونے کی کیا بات ہے؟....تو نے ابھی کہا عورت کی طاقت مرد ہوتا ہے۔ مرد جس قدر بیوروکریٹ ہوگا عورت اتنی ہی طاقت ور ہوگی...وہ لڑکی ایک بیوروکریٹ باپ کی بیٹی اور بیوروکریٹ کی بیوی ہے....پھر کیوں کر کمزور ہوئی؟...اور...ماں...اب میں آ گیا ہوں نا...تیرا بیٹا...تیری طاقت...تو یہ کیوں سوچتی ہے کہ تو کمزور ہے؟...'' یہ کہہ کر نوجوان آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گیا۔

ooo

ویٹنگ روم

اپنا وطن کو چھوڑے ہوئے صدیاں بیت گئیں۔اب تو ماہ وسال بھی یاد نہیں کہ آ باو اُجداد کب جلا وطن ہوئے...... غریب الوطن ہونا، جلاوطن ہونا، ہجرت ہونا ایک دیرینہ روایت ہے یا انسانی تہذیب کے مقدرات کی کتاب میں مرقوم فیصلے۔یہ بات سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے کہ اپنا وطن بہت خوبصورت تھا۔جب اپنا تھا تو خوبصورت تو ہونا ہی تھا۔وہاں شور تھا نا کوئی شر۔ہر سو سکون وقرار تھا۔فرحت ومسرت وشادمانی تھی۔چاروں طرف لہلہاتا سبزہ پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر فضا شب وروز کی رنگینی اور موسموں کی مستی تھی۔اب یہ عالم ہے کہ میری نسل کے زیادہ تر لوگ اپنا وطن بھول گئے ہیں۔کبھی کسی کو یاد آتا ہے کبھی کبھی کسی کو بہت یاد آتا ہے۔

جدامجد نے اپنا وطن خیر باد کیا۔محل نمار ہائش گاہ کو چھوڑنے میں بڑا ہی دکھ ہوا کافی عرصہ تک زبان درزبان اس کا چرچہ ہوا...... پھر ذکر کم سے کم تر ہوتا گیا۔اب تو کبھی یاد آئی تو آپس میں ذکر ہو گیا۔نسل کے بوڑھے اپنا وطن یاد کرتے، یاد کر کے آہیں بھرتے ان کی آواز میں بڑا درد اور لہجہ رقت آمیز ہوتا۔نوجوان اور بچے کبھی اس ذکر میں شامل ہوتے تو بے دلی ان کے رویئے سے ظاہر ہوتی نہ تو کبھی توجہ دیتے اور سنجیدگی کا ہمیشہ فقدان ہوتا۔جب وہی بچے سنِ پیرانِ سالی کو پہنچتے تو ذکر ان کی دلچسپی کا سبب بن جاتا اور وہ بھی اپنی غریب الوطنی کا شدت سے احساس کرنے لگتے اس کا ذکر کرتے وقت ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں یہ سلسہ

دیرینہ وقتوں سے اسی طرح جاری ہے۔ اپنا وطن واپسی کے لئے دلی یا بے دلی سے تیاریوں میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

یہاں اس امر کی جانب یہ اشارہ کرنا ناگزیر ہے جب جب اپنا وطن واپسی کی فکر ہوتی تو اپنے احباب واقربا کے چھوٹنے سے رنجیدہ بھی ہوتے۔ اکثر بزرگ بھی سامانِ سفر باندھتے وقت دُکھی ہوتے اس وقت اپنے وطن واپسی کی خوشی کم اپنوں کو چھوڑنے کا غم بڑا ہوتا۔ حالانکہ واپسی ایک حقیقت تھی۔

اب مسئلہ یہ تھا سفر سے پہلے سامانِ سفر کا باندھنا ضروری اور غیر ضروری چیزوں کا انتخاب کرنا تاکہ بوجھ ہلکا رہے اور سفر میں دقتوں کا سامنا نہ ہو۔ قصدِ سفر بھلے ہی اپنے بس میں نہ ہو لیکن متاعِ سفر اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور اگر ضروری سامانِ سفر کی قِلّت کا احساس شدت اختیار کرلے تو وطن واپسی کا خوف ایک ڈراؤنا خواب بن جاتا ہے۔ وہ بھی اس پل مکھی کی طرح مکڑی کے جال میں پھنسا تھا۔ کوئی غیبی طاقت یا اندرونی جذبہ سفر کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اس نے سامانِ سفر باندھا اور جیسے ہی چلنے کا ارادہ کیا اسے خیال آیا سفر میں کام آنے والا سامان ایک نظر دیکھ لیا جائے لیکن میں تو اپنے وطن جارہا ہوں سامانِ سفر باندھنے کی کیا ضرورت؟ سفر کرتے وقت ذہن سامان کی حفاظت اور دیکھ بھال میں لگا رہے گا اور لطفِ سفر فوت ہوجائے گا۔ سفر طویل ہو یا مختصر لطف سے خالی ہو تو بوجھ بن جاتا ہے بوجھ تلے انسان دبا سہما رہتا ہے۔ اپنے آرام کے لئے متاعِ سفر کا بوجھ کتنا ہی بڑھالے مگر سفر تو پھر سفر ہے۔ تھکا دینے والا۔ اسی لئے سامان کم سے کم باندھے تاکہ سفر آسان ہوجائے حساب کتاب گننے اور شمار کرنے کی الجھن سے نجات مل جائے۔ یہی نجات کامیاب زندگی اور آسان سفر کی علامت ہے اس نے سامان کو ٹٹولا اس میں فالتو چیزیں زیادہ ہیں اور ضروریاتِ سفر کا سامان کم ہے۔ وہ سوچتا ہے اس میں میرا اپنا کیا ہے؟ میں سفر کا تنہا مسافر اور اتنا بوجھ کوئی بوجھ بانٹنے والا بھی نہیں۔ میں اکیلا مسافر بوجھ تلے دبا ہوا۔ ایک کنگال مسا

فرجانب سفر رواں ..... جیسے تیسے اسٹیشن پہنچا ..... اسٹیشن پر مسافروں کا ہجوم۔ سب ہی مسافر انجان منزل کی طرف بھاگے جارہے ہیں حواس باختہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ ٹرین کی آمدورفت کی گہما گہمی کانوں کو بہرہ کرنے والا ایک شور۔ اس بھیڑ میں آنکھوں کی بینائی آشنائی سے محروم، کسی کو کسی کی خبر نہیں نفسی نفسی کا عالم۔ ٹرین لیٹ ہوگئی۔ مقررہ وقت سے کافی لیٹ نہیں ..... نہیں ..... ٹرین ہمیشہ متعین وقت پر آتی ہے۔ شاید مجھے ہی سفر کی جلدی ہے۔ شاید یاد وطن اور احساس جدائی نے وقت کی گنتی کرنا بھلا دیا ہے۔ آخر! میں بوڑھا بھی تو ہوگیا ہوں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی اپنا مل جائے بوجھ اٹھانے میں مدد ہوجائے گی سب ہی مسافر اپنے اپنے بوجھ میں دبے ہوئے ہیں کوئی کسی کا مددگار نہیں اس نے اپنا بوجھ اٹھایا جیسے تیسے ویٹنگ روم میں داخل ہوا اسے ویٹنگ روم، عارضی وطن محسوس ہوا اور عارضی وطن ویٹنگ روم جیسا وہ عارضی وطن اور ویٹنگ کے فرق کو جاننے کے لئے دماغ کھپانے لگا؟ نتیجہ صفر نکلا۔ ویٹنگ روم سفید پتھروں سے بنا ہوا محل جیسا حسین و جمیل مگر گردوغبار سے اٹا ہوا ..... دیواریں رنگ وروغن سے آراستہ خاک آلود چھت پر نقش ونگار بنے ہوئے مگر صفائی نہ ہونے سے دھندلے پڑ گئے تھے ..... اس نے ویٹنگ روم میں راحت کی سانس لی ..... باہر کے ناخوش گوار موسم کے مقابلے میں اندر کا موسم خوش گوار اور مناسب تھا اپنا سامان احتیاط سے کمرے کے ایک کونے میں رکھا ویٹنگ روم کی بے ترتیب چیزوں کو قرینہ سے رکھنے لگا۔ آئینہ کو کھونٹی پر سیدھا کیا فرنیچر کی سمت بدلی ..... اور ویٹنگ روم کی صفائی ستھرائی میں لگ گیا تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایک مسافر ہے۔ نہ تکان کا دھیان، نہ بوجھ کی الجھن۔ ویٹنگ روم کی چہار دیواری رنگین اور خوبصورت تصاویر سے سجی ہوئی تھیں ان مختلف تصویروں کے درمیان دیوار کا مختصر حصہ خالی پڑا تھا جو سپاٹ اور بدنما دکھائی دے رہا تھا اس نے سوچا اگر اس پر کوئی تصویر آویزاں کردی جائے تو اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جائیں گے۔ ویٹنگ روم کی زیب وزینت اور آرائش میں اس قدر

مصروف ہوگیا کہ مسافر ہونے کا گمان اس کے ذہن سے محو ہوگیا وہ بھول گیا کہ ویٹنگ روم میں اس کا قیام صرف اتنا ہے کہ جب ریل گاڑی آجائے تو اس پر اس کو سوار ہو جانا ہے اور اسے اپنے وطن جانا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کو اپنی مرضی سے، کسی سازش کے تحت یا کوئی اور وجہ سے خدا جانے اپنا وطن خیر باد کہنا پڑا۔ وہ بوڑھا ہوگیا ہے یادداشت کمزور ہوگی ہے۔ نا توانی اور کمزوری ہونے کے سبب مختلف بیماریوں کا غلبہ رہتا ہے جسم سے قوتِ مدافعت زائل ہوگئی ہے معمولی بیماری بھی بڑی ہو جاتی ہے۔ خیر یہاں تو معاملہ پیرانِ سالی کا ہے اگر عہد طفلی سے جوانی تک کسی بھی عمر میں کمزوری ہو تو معمولی سے معمولی بیماری بھی حاوی ہو جاتی ہے اور اس وقت اپنے وطن کی یاد شدت سے جاگنے لگتی ہے اور اس وقت کمزوری یا کوئی اور وجہ سے دل کانپنے لگتا ہے، گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتا ہے چونکہ اپنوں کو چھوڑنے کا غم بڑا وطن کی یاد کا الم چھوٹا ہوتا ہے۔؟

ویٹنگ روم کے بائیں جانب دبیز خوش رنگ قالین بچھی تھی۔ دائیں طرف صوفہ پر اس کے قدم خود بخود بڑھنے لگے وہ تھکا ماندہ اس میں دھنس گیا سامنے دیوار پر تصویروں کے درمیان خالی جگہ پر نظر جم گئی..... وہ اسی لمحہ اٹھا اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکلا..... گرمی کی وجہ سے دھوپ کی تمازت شدید تھی۔ آسمان صاف تھا ہلکے نیلے رنگ پر سفید بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ سورج سر کے اوپر آگ برسا رہا تھا۔ اچانک لو کے گرم تھپیروں نے اس کے منہ پر طمانچے لگانے شروع کر دیے وہ گھبرا گیا اسے پیاس محسوس ہوئی ویٹنگ روم کی طرف اس کے قدم واپس ہونے لگے دروازے میں داخل ہوتے ہی پیاس نے شدّت اختیار کرلی۔ اس کی آنکھیں نا معلوم شے کے لئے بے چین ہوگئیں اسے یاد آیا اسے پانی کی تلاش ہے۔ فریجر کے قریب گیا۔ پانی کا گلاس بھرا۔ غٹ غٹ ایک سانس میں پی گیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پھر گلاس میں بھرا۔ غٹ غٹ۔ پیاس ہے کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ جوں جوں وہ پانی پیتا تو نس بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پانی گرم کھولتا ہوا لگ

رہا تھا۔ وہ گھبرایا ہوا۔ بار بار پانی پیتا رہا پیاسی نظریں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ ویٹنگ روم چند لمحہ پہلے جنتِ نشاں دکھائی دے رہا تھا اچانک دوزخ میں تبدیل ہو گیا۔ بے چینی کے عالم میں وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے اس کی نگاہیں جائے پناہ تلاش کر رہی ہوں دیوار پر آویزاں تصویروں پر جا کر نگاہ ٹھہر گئی اس نے حواس درست کئے آنکھوں کو تصاویر کی جانب سمیٹا۔ اور صوفہ پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔

تصویر نمبر ایک۔ دو جمع تین ضرب دو بولنے لگی۔ خوبصورت سبز قالین کے درمیان پہاڑ کی ہلکی سی سیاہی برف کی چادر سے ڈھکی ہے۔ روئی دھننے پر اُڑنے والا دھواں جیسا برف چاروں طرف گر رہا ہے۔ پہاڑ کی پشت پر ڈوبتے سورج کی شفق آسمان کے چھوٹے سے کونے پر پھیل رہی ہے۔ سبز زمین پر قد آور درخت صف بنائے صلوٰۃ میں مصروف ہیں۔ خوشگوار سبک خرام ہوا کی تال پر مختلف رنگوں کے پھول قطار لگائے نازک شاخوں پر نا زنینوں کی طرح مٹک رہے ہیں۔ ہلکا ہلکا سرمئی اندھیرا مشرق میں پھیلا ہے اور اس کے درمیان سے ماہتاب جھانکتا کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپتا جیسے کوئی پردہ نشین چلمن کے پیچھے بیٹھی مسکراہٹ کے پھول بکھیر رہی ہو رنگین اور خوشبو سے معطر فضا میں ایک جوان جوڑا اٹھکیلیاں کر رہا ہے فرشتوں جیسے معصوم ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی دلنواز مسکراہٹیں اس جوڑے کا استقبال کر رہی ہیں اور برف کے گولے بنا بنا کر ان کی طرف اچھال رہے ہیں ذرا فاصلے پر کچھ جانور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھاس چر رہے ہیں ایک عجیب اور دلفریب منظر کو دیکھ کر اس کا دل خوش ہو رہا تھا

''لواز لائف'' بیساختہ اس کے منہ سے نکلا

شبنم کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ میرے دل کی کلی پر ایسے گری کہ پھول کی طرح کھل گیا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹی سرخ جوڑے میں ملبوس، میرے گھر میں گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح برسی۔ میرا گھر ہرا بھرا ہو گیا۔ زندگی کا ہر درد انگیز لمحہ اس کی ایک مسکراہٹ

سے نشاط انگیز ہو جاتا۔ پھر وہ اپنے پھول سے بچوں میں ایسی مست ہوئی کہ میں فاضل اور فضول شے بن گیا۔ محبت کا سفر جب ممتا پر رکتا ہے تو وہی شریک حیات کی منزل ہوتا ہے۔

''شبنم بھی ہے بچے بھی ہیں اور میں سفر کا اکیلا مسافر۔ بالکل تنہا'' اس کے منہ سے نکلا

اچانک تصویر نمبر دو۔ تین جمع چار ضرب دو بولنے لگی۔ ایک بارعب شخص سونے کا تاج اور چاندی کے نعلین پہنے بڑے کروفر کے ساتھ تخت نشین تھا سامنے ایک باریش انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا کھڑا تھا۔ ایک بدنما شکل کا آدمی ہاتھ میں تلوار لئے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چھلے دار مونچھوں کے نیچے سیاہ ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں حکم کی منتظر تھیں۔ درباری نگاہیں بسجود ہاتھ باندھے اپنے ناخدا کے سامنے ادب واحترام کے ساتھ قطار میں کھڑے تھے۔

''سچ بولنے کا انجام سزائے موت'' بیساختہ اس کے منہہ سے نکلا

تصویر نمبر تین۔ چار جمع پانچ ضرب دو پر اس کی نگاہ گئی ایک مثلث کے اندر روشنی کو بکھیرتی ہوئی آنکھ، یہ آنکھ علم کی علامت، مثلث کے اضلاع کے چاروں طرف پھوٹتی ہوئی کرنیں جو جہالت کے سیاہ بادلوں کو ہٹا دیں گی۔

کئی چھڑیوں کا ایک بنڈل:- اتحاد میں قوت ہے۔

ٹوٹی ہوئی زنجیر:- غلامی سے نجات آزادی کی علامت۔

زمین پر گرا ہوا عصائے شاہی! پیروں کے نیچے دبا ہوا سونے کا تاج۔

سانپ اپنی دم کو کاٹتے ہوئے ایک حلقے کی صورت میں:- ہمیشگی کی علامت کیونکہ کسی حلقے کی نہ تو ابتدا اور نہ انتہا۔

پنکھ دار عورت:- قانوں کی تمثیل۔

قانون کی تختی:- قانون سب کے لئے ایک ہی جیسا، اس کے سامنے سب برابر ہیں۔

ایک کھدر دھاری نیتا کی مٹھی میں انصاف کی دیوی۔

تصویر نمبر چار۔ پانچ جمع چھ ضرب دو بولنے لگی۔ بڑی بڑی عمارتوں کے درمیان

چھوٹے چھوٹے موتیوں جیسے دانتوں کے بیچ پائیریا کے کالے کالے کیڑے ان کے اوپر اڑتے ہوئے ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر۔ سڑک پر دوڑتی ہوئی موٹر گاڑیاں فٹ پاتھ پر دوڑتی ہوئی سائیکلیں اور پیدل دوڑتے ہوئے لوگ۔ شراب اور رقص و سرود میں ڈوبی ہوئی محفلیں۔ دیواروں کے سایہ میں زمین پر سوئے ہوئے انسان، جھوٹن پر کتے کی طرح دوڑتے میلے کچیلے مدقوق بچے۔

وہ سوچنے لگا وٹینگ روم کی دیواروں پر لگی ہوئی یہ تصویریں زندگی کی تمام بدصورتیوں کے ساتھ کتنی حسین وجمیل اور خوبصورت ہیں۔ پوری کائنات ویٹنگ روم میں سمٹ گئی ہے۔ کائنات ویٹنگ روم ہے اور ویٹنگ روم کائنات بن گیا ہے۔ لیکن تصاویر کے درمیان دیوار پر چھوٹی سی خالی جگہ اس سجے ہوئے ویٹنگ روم میں کتنی بدزیب نظر آرہی ہے اور ویٹنگ روم اس کی وجہ سے بدنما دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اس کی آرائش اور سجاوٹ کے لئے پریشان ہوگیا..... ارے..... مجھے کیا..... کرنا ہے؟

میں تو ایک مسافر ہوں۔ مجھے ویٹنگ روم کی زیب وزینت سے کیا لینا دینا؟۔ میں ایک تنہا مسافر۔ جس کی اہل ہے مگر نہیں ہے۔ جس کے عیال ہیں لیکن نہیں ہیں۔ جس کے عزیز واقارب، دوست واحباب ہیں مگر نہیں ہیں۔ کوئی نہیں ہے میرا وہ سوچنے لگا اس خالی جگہ کو مختلف ممالک میں چلنے والے سکوں کی تصویر لگا کر بھر دی جائے۔ خالی جگہ بھر جائے گی اور ویٹنگ روم کی زیبائش میں اضافہ ہو جائے گا۔ پھر وہ سوچتا ہے میں تو ایک مسافر ہوں مجھے مال و دولت سیم وزر سے کیا لینا دینا۔ اچانک ویٹنگ روم کے دروازے پر اس کی نظر گئی ایک ہاکر تصویریں فروخت کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے باہر نکلا مختلف تصاویر کو ہر زاویہ سے بغور دیکھنے لگا۔ اس کی نظر ایک تصویر پر جم گئی سمندر خشک ہو گیا ہے۔ ریت پر سیم وزر بکھرا ہے، موتیوں، ہیروں اور قیمتی پتھروں کے درمیان مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں۔ حواس باختہ انسانوں کا گروہ، جن کے مدقوق چہرے گال پچکے ہوئے، پیٹ جن کے کمروں

مے لگے ہوئے ان مری ہوئی مچھلیوں پر جھپٹ پڑے ہیں اور ان کو بٹورنے کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں یہ ٹھیک رہے گی اس تصویر کو خرید لوں اور اس خالی جگہ کو بھر دوں ویٹنگ روم کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جائیں گے۔ پھر اسے خیال آیا کہ میرے متاعِ سفر میں میرا کچھ ہو یا نہ ہو لیکن برسہا برس سے ایک تصویر رکھی ہوئی ہے جسے بڑی حفاظت سے لپیٹ کر میں نے رکھ رکھی ہے شاید آج کام آجائے اس کے استعمال کا یہی مناسب وقت ہے اسے نکالا جائے اور اس خالی جگہ میں لگا دیا جائے۔

اسے یاد آیا وسیع و عریض میدانِ عرفات میں فریضۂ حج ادا کرتا ہوا انسانوں کا جمِ غفیر ہے۔ ایک جسمانی اور روحانی منظر ہے..... لبیک..... اللّٰھم لبیک کی دلسوز صداؤں سے میدان گونج رہا ہے سینوں میں سوز و گداز کی کیفیت طاری ہے۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے ہیں اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں سامان ندارت۔ وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ ہذیانی سی کیفیت اس کے اوپر طاری ہوگئی ہانپتا کانپتا وہ صوفہ پر گر گیا۔ سوچنے لگا میرے سامان سفر میں کارآمد چیزوں کی قلت تھی جو وطن پہنچ کر کام آتیں۔ اب تو ویٹنگ روم کی مصروفیت میں بچی کچی متاع بھی ضائع ہوگئی۔ نقاہت اور مایوسی کے سبب اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اچانک ٹرین آگئی اس کے پاس اتنی سکت اور طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ صحیح طور سے ٹرین میں سوار ہو سکے۔ اٹھنے کی کوشش میں وہ وہیں گر گیا چار آدمیوں نے شاید وہ بھی مسافر تھے جیسے تیسے اسے اٹھایا اور ٹرین میں اسی حالت میں احتیاط سے لٹا دیا ٹرین اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔

ooo

بجوٹ

اس ایک پل نہ روئی، نہ مسکرائی، میں حیران تھی مرد کی اس بے وفائی پر کہ پندرہ سال خدمت کے عیوض تحفہ میں طلاق ملی۔ عورت آدمی سے چھوٹے دیر یا سویر، چھوٹتی ضرور ہے کہ دونوں کا ساتھ عارضی ہے۔ زندگی خود عارضی ہے ایسا تو ہے نہیں کہ جوڑا ایک ساتھ مرے اور پھر قبریں برابر برابر بنیں، بعد میں دو درخت اس مٹی سے اُگیں ہوا چلے شاخیں پتے رقص کریں، جھومیں گائیں، گلے لگائیں اور مسکرائیں ---اولاد تو کہیں سے بھی اور کیسے بھی لائی جاسکتی ہے، گود لینا ہی ضروری تھوڑی ہے میری سہیلی منجو جو میری کلاس فیلو تھی، ہم راز بھی تھی لیکن ہم نوا نہیں اور ہم خیال بھی نہ تھی۔ اس نے نہ جانے کتنے قصے سنائے یہ کہہ کر کہ کوئی مشکل نہیں، پریشان مت ہو! فلانی گنگا اسنان کرنے گئی اور گود بھر کر لائی..... گنگا کے پانی کی تاثیر ہے بنجر دھرتی اُپجاؤ ہو جائے..... گودہری ہو جائے --- لیکن میرے لیے گنگا اسنان، گنگا جل کا وردان جائز تھوڑی تھا۔ میں کیوں الزام دوں اپنے شریکِ حیات کو..... نہیں ..... نہیں۔ شریکِ جزوقتی کو..... جب قصور سب اپنا دکھائی دیتا ہے۔ عورت ہوں تو اولاد کیوں نہیں؟ بنجر زمین پر ہل کتنا ہی لگے سرسبز نہیں ہوتی۔ گائے دودھ نہ دے، قصائی کے کھونٹے سے باندھ دی جاتی ہے، گھر کے کھونٹے سے بندھے مفت میں دانہ پانی کھائے، دھرتی کا بوجھ کہلائے ---لیکن..... لیکن عورت ہونا خدا ہونا، نہیں ہونا ہے..... کیسے نادان ہوتے ہیں یہ مرد..... صرف مرد ہی نہیں..... عورتیں بھی..... سب

کے سب دشمنِ جاں.....

''بجوٹ کے سایہ سے بھی نویلی دلہن کو بچنا چاہیے'' جیٹھانی نے کہا تھا۔

''باجی..... میں کوئی بھوت ہوں'' سہمی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر۔

''میں نے کب کہا کہ تم بھوت ہو..... لیکن عورت بھی نہیں'' فیصلہ کن لب ولہجہ۔

''یہ سوچ سراسر بدعت ہے۔''

''حقیقت ہے..... (وقفہ)..... بجوٹ ہونا بدعت ہے۔''

وہ کسمسائی اور سہمے ہوئے انداز میں بولی ''امّی دھوپ لینے کے لیے چھت پر آ گئی تھی، چچی جان پہلے ہی سے یہاں موجود تھیں۔''

''دلہن دھوپ زیادہ نہ لو، ہم نہیں چاہتے غیرضروری چیزوں سے پیٹ پھولے۔''

دلہن بے دلی سے سرپٹ اُٹھی، زینہ اُتر گئی..... پیچھے پیچھے ساس بڑبڑاتی ہوئی چل دی۔ میں گُم صُم دھوپ میں بیٹھی تنہا رہ گئی۔ دھوپ چند لمحے پہلے رحمت تھی..... سورج سمیت بدن میں داخل ہوئی اور سخت سردی میں دل و دماغ کو نار کی مانند جلانے لگی..... سوچنے لگی بجوٹ ہونے میں میرا کیا قصور؟ دن رات جلنے کے لیے بجوٹ ہونا از خود نارِ جہنم ہے..... زندہ رہنا بھی ہے اور جلنا بھی ہے --- کیا میں اپنی مرضی سے بجوٹ ہوں؟ میرا بس چلے، صبح لڑکا، شام لڑکی پیدا کروں! ایسی برکت نازل ہو کہ آدمی کہے بس کر اللہ، رزق کہاں سے آئے؟ اور اللہ کہے رازق ہوں میں..... رزق کے خوف سے اپنی نسل کو مت قتل کرو..... اے خالق! مجھے تو افسوس ہوتا ہے اپنے ہونے پر کہ مجھے تخلیق کار بنایا اور تخلیق سے ترسایا..... ایسا سوچتے ہوئے میرے دو آنسو آنکھوں سے ڈھلکے..... رُخساروں پر پھسلے..... موتی کی طرح دامن میں چنے اور سٹ پٹ زینے سے اُتر گئی..... سورج بھی مغرب کی جانب آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا، دھوپ سمٹ رہی تھی، سردی بڑھ رہی تھی۔ مگر دل و دماغ کی

آگ ابھی تک سرد نہیں ہوئی ہے..... جب بھی کریدو تو خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری اندھیرے میں جگنو کی طرح راستہ دکھانے کے لیے کافی ہے۔

منجو کی ماں نے کہا تھا ''بھائی صاحب صابرہ بڑی بھاگوان ہے۔''

ابا جی نے چونک کر دیکھا ''صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔''

میں نے پنڈت جی کو ہاتھ دکھایا تو بولے ''بٹیا لکشمی پر سوئے گی، دودھو نہائے گی پوت پھلے گی۔''

ابا جی نے ایک اچٹتی سی نگاہ منجو کی امّی پر ڈالی اور گہری آنکھوں سے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھنے لگے۔ منجو کی امّی اس سے چپ چاپ چلتی بنیں ویسے بھی وہ ابا جی کی عزت کرتی تھیں اور ڈرتی بھی تھیں۔ وہ دروازے کو عبور کرنے تک انھیں گھورتے رہے۔

''ہتھیلی دکھانا گناہ ہے'' وہ بڑبڑائے۔ مخاطب ہو کر بولے ''تم نے تو ہاتھ دکھانا شروع کر دیے..... تھوڑی دیر خاموشی رہی..... جو ہاتھ دکھاتے ہیں، منھ دکھانے کے لائق نہیں رہتے..... اب تم دسویں درجہ میں ہو..... عمر کے چودھویں سال میں ہو..... چودھویں چاند کی طرح خوب صورت ہو..... غیر مرد کے ہاتھ میں یوں ہاتھ نہیں پکڑا دیتے۔''

''جی ابا جی۔''

''مرد کا سب کچھ اچھا ہوتا ہے، نظر خراب ہوتی ہے۔''

''مطلب، بینائی۔''

''بینائی نہیں..... آنکھ..... حفاظت کرو اپنی اور اپنی آنکھوں کی۔''

میں نے سنا گرہ باندھا، آج تک گرہ نہ کھولی..... میں سوچنے لگی منھ دکھانے کے لائق نہیں رہتے سے کیا مطلب ہے؟ شکل بھی ایسی بُری نہیں..... روز آئینہ دیکھتی تھی..... ہر زاویہ سے دیکھتی ہوں..... نیچی نگاہ ڈال کر سامنے سے دیکھتی ہوں..... آئینہ کے جانب کمر کر کے ترچھی نگاہ سے پشت کی طرف دیکھتی تھی..... سہیلیاں کہتی تھیں تم بہت خوب

صورت ہو..... حسن کے معاملہ میں خود بینی وخود آرائی نہ ہو، تو خوب صورتی بے معنی ہو جاتی ہے..... ابّا کہتے تھے خوب صورتی ڈھک کر رکھو..... جو بھی نظر ڈالتا ہے، بُری ہی نظر ڈالتا ہے..... بوڑھی نظر بھی خوب صورت موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی..... خوب صورتی نظر میں رہے محفوظ رہتی ہے اور نظر ہی محظوظ بھی ہوتی ہے۔

شادی خوب صورتی اور جوانی کا محفوظ ٹھکانہ ہے۔ شادی ہوئی، شادی کا سنِ بلوغت پر ہونا والدین کے فرائض کی ادائیگی، جوانی کی کوئی بھول والدین کے سر نہ جائے، بازپُرس سے بچنے کا یہی ایک راستہ ہے.....

''بس ایک بچہ دے دو..... میری نسل کا چراغ گل نہ ہونے پائے۔'' شادی کی پہلی رات بے چاری ساسوامّی کا بس یہی ایک مطالبہ۔

''کہاں سے لاتی.....؟ کیا یہ میرے ہاتھ میں تھا۔''

اب سوچتی ہوں کاش بچہ، میں جہیز میں لے جاتی..... خیر سے دولت و جائداد نصیب میں نہیں ہے ورنہ وارث مانگتے، اور بھیج دیتے گنگا اسنان کو ---- رات ہو چکی تھی، ستارے کالی چادر پر ٹنکے تھے، سوچ رہی تھی کوئی ایک ستارہ آسمان سے اُترے، میری کوکھ میں داخل ہو اور میرے اندھیرے آنگن میں روشنی کر دے۔ اچانک بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہوا، میں اس کی آہٹ سے چونکی۔ ''عارف تمہاری بھابی بجوٹ کو بھوت کہتی ہیں۔''

''صابرہ..... بھوت اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو ستائے۔''

میں مسکرائی اور عارف کے گلے کا ہار بن گئی۔ ''میری عافیت تنگ کر رکھی ہے، اُٹھتے بیٹھتے طعنے..... میرا جینا مشکل کر دیا ہے۔'' آنکھیں بھیگ گئیں۔

عارف نے میرے آنسو سمیٹے۔ ''یہ عالمِ کون وفساد ہے، چند روزہ ہے رات کا سینہ چاک کر کے سحر بیدار ہوتی ہے۔''

''میں کون عاقبت کے بورے سمیٹ رہی ہوں۔''

''دیکھو مالکِ کون و مکاں عاصم ہے، وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔'' عارف نے سمجھایا۔

''بے شک..... انسان کو ربّ نے نطفے جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا۔ اس کی خودی کا طغیان تو دیکھو وہ فرعون بن بیٹھا۔''

''انسان غرورِ نفس میں مبتلا ہے'' عارف نے کہا۔

''طلوعِ آفتاب کی حد نہیں دیکھتا۔''

ایک روز، غروبِ آفتاب کے وقت سورج سمندر کے سیاہی مائل گدلے پانی میں ڈوب رہا تھا، میری آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب رہی تھیں۔ رات سوچنے، سونے اور رونے کے لیے بنی ہے۔ رونے کے اس طوفان میں آنکھیں صاف ہوئیں۔ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔

''صبح عاقر بجوگی بنگالی بابا کے پاس چلیں گے۔''

''یہ ایک بابا ہے یا تین'' میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''ارے بھئی ایک ہی بابا ہے۔''

''بنگالی بابا کیا کریں گے؟''

''چنتا ہرڑن کریں گے۔''

''مطلب خود عاقر، دوسروں کی گود بھریں گے، خود بجوگی پھر بھی چنتا ہرن کہلائیں گے۔'' میری ہنسی کمرے میں گونج گئی تھی۔

''ارے بھئی ہوتا ہے، کائنات کو روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، سورج کو نہیں، پھر بھی سورج چمکتا ہے۔''

عارف نے کچھ اس طرح سے کہا تھا کہ میں خاموش ہوگئی۔ موسم کا تعلق دل سے

ہوتا ہے۔ دل اُداسی کے سیاہ بادلوں سے گھرا تھا، ذہن میں جگنو جل بجھ رہے تھے اور آنکھوں سے رم جھم بھی ہو رہی تھی۔ خیال آیا تہجد کے معنی نیند توڑنے کر اُٹھنے کے ہیں لیکن میری پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی اور نیند اپنی مخملی چادر میں مجھے نہ لپیٹ سکی تھی۔ بڑی حجت کے بعد اُٹھی، وضو کیا چار رکعت نوافل ادا کیے..... دستِ دعا دراز کیے..... اے کون و مکاں کی باخبر ہستی، تو نے بِنا ماں باپ کے آدم، بِنا ماں کے حوا، بِنا باپ کے عیسیٰؑ کو بنایا۔ اپنی نظرِ خلق کی قوت سے کُن کا کرشمہ میری کوکھ میں ڈال دے کہ میری شب، روز کی روشنی میں ڈوب جائے۔'' بہتے ہوئے زار و قطار آنسوؤں کی دھار سے صبحِ کاذب کی گہری لکیر کٹی، صبح صادق نمودار ہوئی، فجر کی نماز پڑھنے کے بعد تیار ہوئی، عارف بھی اُٹھ چکا تھا۔

دونوں بنگالی بابا کی طرف چل دیے چوں کہ ٹوکن اشراق سے پہلے بٹتے ہیں، دیر ہونے پر بنگالی بابا بیماروں اور بدحالوں کو نہیں دیکھتے، چاہے کتنی ہی ہنگامی ضرورت ہو۔ ایک عجیب سیکولر منظر وہاں طاری تھا۔ گیرو رنگ کے لباس میں ملبوس ایک لحیم شحیم، مٹکے کی طرح پیٹ کرسی پر رکھے شخص کی بڑی بڑی آنکھیں حلقہ سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں، بیٹھا تھا۔ ایک چوڑی چکلی میز پر مختلف رنگوں کی پرچیوں کی گڈیاں رکھی تھیں، ایک چھوٹی سی لکڑی کی پیٹی جس پر ''دان دیں'' اردو اور ہندی میں لکھا تھا۔ بائیں جانب انسانوں کی لمبی قطار کی طرف ماتھے پر لگے کالے تلک سے اشارہ کرتا۔ ہر شخص اپنی پریشانی بتا کر ایک رنگ کی پرچی لیتا، پیٹی میں سوکا نوٹ موڑ کر ڈالتا، موہ جال سے بچنے کا درس لیتا، آگے اندر کی طرف بڑھ جاتا۔ عارف نے بھی اپنی ضرورت کے مطابق ہرے رنگ کی پرچی لی، میرے ہاتھ سے سوکا نوٹ پیٹی میں ڈلوایا..... اس مختصر وقت میں سادھو نے سر سے پاؤں تک اپنی آنکھوں کے فیتہ سے پیمائش کر لی باوجود اس کے کہ میں برقع میں تھی جس کو ابّا نے یہ کہہ کر پہنوایا تھا کہ نظر بد سے حسن کی حفاظت اور شریعت کی پابندی کے لیے یہ ضروری ہے، لیکن ان آنکھوں سے کیسے بچا جائے جن میں ایکسرے لینس لگے ہوں۔

کوریڈور سے نکل کر جیسے ہی صدر دروازے سے عارف کے ساتھ اندر داخل ہونے کی کوشش میں آگے بڑھی، بائیں جانب سفید کرتے پائجامہ میں ملبوس کالے رنگ کی گول ٹوپی جس پر تقریباً چوبیس لکیریں بنی تھیں سر پر رکھے، ایک شخص بیٹھا تھا۔ سامنے چھوٹی سی چوکی پر رکھے رجسٹر پر نام اور رسید نمبر اندراج کر رہا تھا۔

دوسرے مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازے کے دائیں طرف ایک تخت جو دیوار سے سٹا ہوا تھا، جس پر ایرانی قالین بچھی تھی، دیوار پر پنج تن پاک کا کلینڈر اور اسی کے برابر مکان اور دوکان کی برکت کا تعویذ دیوار پر ٹنگا تھا۔ تخت پر زعفران کی دوات اور تین قلم اور دو انچ چوڑی کاغذ کی پیٹیوں کا بنڈل رکھا تھا۔ دیوار سے چپکی مسند سے کمر لگائے ایک سیاہ فام، سیاہ باریش، ہرے کُرتے پائجامے میں ملبوس سر پر سبز رنگ ٹوپی لگائے شخص بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں تسبیح، شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے اشارے سے صندل کے دانے پلٹ رہا تھا۔ اس کی بند آنکھیں وا ہوئیں، ساکت ہونٹ ہلے، ''سر پٹک کر مایوسی کی پوٹلی کھولنے آج آئی ہو'' بابا نے لعن کیا۔

''بابا جب مصیبت سر پر آن پڑتی ہے تو خیرات بٹنے لگتی ہے'' عارف نے اظہارِ شرمندگی کیا۔

بابا نے میری طرف دیکھا۔ ہاتھ میں ہری پرچی پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نیچے تک اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے ''کوکھ سونی ہے'' بابا نے انغاض کیا۔

میں سمجھ نہیں پائی کہ اظہارِ تعجب یا مذاق اڑانے کے لیے سر کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کو ہلا رہے ہیں۔ اس وقت تو میں بھی حیرت زدہ ہوگئی تھی کیوں کہ ضرورت اور مصیبت پتھر کو بھگوان بنا دیتی ہے۔ اب جب کہ ہر مصیبت اور ضرورت سے نجات مل چکی ہے۔ ہری پرچی گود ہری کی، سفید پرچی روزگار کی، سرخ پرچی بیماری کی نشانی ہے۔

رات گئی، بات گئی۔ ایک تعویذ برہنہ جسم پر مَل کر جلانے کا، ایک پیٹ پر باندھنے کا، ایک کانچ کی بوتل میں ڈال کر صبح وشام پانی پینے کا۔ تعویذ ملے، تعویذ بندھے، تعویذ پیے۔ چھ مہینے علاج چلا، پھر وہی ڈھاک کے تین پات عاقر جو خود لاولد ہے تو کسی کو کیوں کر ولد بنا سکتا ہے، وہ بجوگی ہے دوسروں کو کیسے مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے، جو خود کنگال ہے دوسروں کو تعویذوں کے ذریعہ دھن وان کیوں کر بنا سکتا ہے؟۔ یہ وہ سوالات ہیں جو آج بھی ذہن کی پٹاری میں پھن پھیلائے کھڑے ہیں۔ ان کے پاس تو آدمی ہر گھر در سے مایوس ہونے کے بعد ایسے پہنچتا ہے کہ دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا۔ اس کے باوجود درِ خالق پر دعا اپنی جگہ ہوتی رہی۔ کارگزاری اپنی جگہ چلتی رہی۔ اگر رب چاہے سایہ پھیلا دے، دائمی سایہ بنا دے، سورج تو صرف ایک دلیل ہے جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے وہ سائے کو اپنی طرف سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن سورج سمٹ گیا تھا، نیلے آسمان کا رنگ سرخ سے سیاہ مائل ہو گیا تھا، جھٹ پٹے کے بعد۔ مشہور ڈاکٹر جاوید جو بے اولادوں کے علاج میں ماہر تھے، بڑے ہی خوش اخلاق، خوش پوش انسان تھے۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ ڈاکٹر کا پُر مذاق طبیعت کا ہونا مریض کا آدھا درد دور ہونا ہے۔ نہ جانے کتنی ہی سونی گودوں کو آباد کر دیا۔ دولت اور شہرت کما کر دور دراز شہروں میں ناموری کمائی۔ دنیا میں عزت پانے کے لیے یوں تو دولت ہی کافی ہوتی ہے اگر شہرت مفت میں مل جائے تو کیا ہرج ہے۔ پھر دولت راستہ نکالتی ہے شہرت کا۔ اولاد کی تمنا لیے ہم نے کلینک کے لیے راہ نکالی۔ ڈاکٹر نے بڑی احتیاط اور تجر نگاہی سے ایک ایک ٹسٹ کیا۔ دوسرے دن رپورٹ ہاتھ میں تھماتے ہوئے ٹکا سا جواب ''آپ باپ نہیں بن سکتے۔'' میں آج بھی یہ سوچ کر حیران ہوں کہ مرد جب باپ نہیں بن سکتا تو عورت کیسے ماں بن جائے گی؟ یوں تو کُن سے دنیا فیکون ہو گئی، لیکن آنکھیں کھول کر جب ذرا اس زمین کی روئیدگی دیکھتی ہوں تو ٹکڑے ٹکڑے بادل آسمان پر آہستہ آہستہ باہم جڑتے ہیں پھر ایک کثیف ابر

بنتا ہے اور بارش کے قطرے ٹپکتے ہیں، لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ اکثر کثیف بادل ایک دوسرے میں سمٹنے کے بعد بھی زمین بارش سے محروم رہ جاتی ہے۔

.....

موسلا دھار بارش ہونے کے بعد، تھوڑی دیر رم جھم ہوئی۔ بادل پھٹ گیا، مطلع صاف ہو گیا رونے سے جیسے آنکھیں صاف ہوتی ہیں۔ ہوا کی خوش خرامی سے موسم خوش گوار ہو گیا ہے۔ عارف کا دل ایک بے معنی خوشی کے احساس سے بلّیوں اچھل رہا ہے۔ سلمہ نے بڑے چاؤ سے بیٹے کو تیار کیا جو آؤٹنگ کے لیے بہ ضد تھا۔ عارف نے موٹر سائیکل نکالی، حمزہ کود کر بیک گدی پر بیٹھ گیا۔ دس کلومیٹر چلنے کے بعد چوکو بار آئس کریم کھانے کی غرض سے جیسے ہی دائیں جانب گاڑی کو ٹرن کیا سامنے جاوید کلینک بورڈ پر نظر گئی، بریک لگائے اور غیر ارادی طور پر اس کے قدم اس میں داخل ہو گئے۔

''آیئے مسٹر عارف'' ڈاکٹر جاوید نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔

''آپ سے تقریباً چھ سال کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔''

''اور عارف صاحب کیسی گزر رہی ہے؟''

''مزے کی.....'' جاوید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بچہ آپ ہی کا ہے۔''

''کوئی شک'' عارف نے مسکراتے ہوئے بچہ سے سلام کرنے کو کہا۔

''نہیں..... نہیں، آپ کی بیوی کہاں ہے، پھر تو وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''میں نے دوسری شادی اپنی سکریٹری سے کر لی تھی۔'' تھوڑے وقفہ کے بعد..... ''وہ ایک شوخ مزاج، بہت خوب صورت عورت ہے۔ آپ ملیں گے..... خوش ہوں گے۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں بچہ کو دیکھ کر ماں کی خوب صورتی کا اندازہ ہو جاتا ہے'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب، میری سونی زندگی میں بہار لوٹ آئی ہے۔''

''یوں کہیے آپ کی پھیکی زندگی میں رنگینی لوٹ آئی ہے۔''

آپ نے کہا تھا ''آپ باپ نہیں بن سکتے؟''

''لیکن میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کی بیوی ماں نہیں بن سکتی'' ڈاکٹر مسکرایا۔

تھوڑی دیر کے لیے ماحول میں خاموشی طاری ہوگئی۔

''امّی سے پیار کرتے ہو یا پاپا سے۔'' ڈاکٹر نے بچے کو مخاطب کیا۔

''امّی تے'' بچے نے اپنی توتلی زبان میں کہا۔

''پاپا سے نہیں کرتے؟''

''ہاں..... دونوں تے۔''

''آپ کی پہلی بیوی کا کیا ہوا؟'' ڈاکٹر نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''ضروری نہیں ہے بنجر زمین کی آبیاری کی جائے..... میں نے اسے طلاق دے دی۔'' عارف نے کہا۔

''آپ نے بُرا کیا'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟'' عارف نے بے زاری کا اظہار کیا۔

''کیوں کہ تمہاری پہلی بیوی ایک صابر محتاط اور خود محفوظ عورت تھی۔''

میز پر رکھی ہوئی الحیا تین سیرپ کی بوتل پر بچے کا ہاتھ لگنے سے نیچے گر گئی۔ اچانک چھناک کی آواز ہوئی، ڈسپنسری کی خاموشی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی..... بچہ سہم گیا، ''پاپا چلئے'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

ooo

مداری

تماش بینوں کا ہجوم گھیرے میں کھڑا تھا۔ مداری ڈگڈگی بجا بجا کر چاروں طرف گھوم رہا تھا۔

''ہاں تو مہربان، قدردان یا تو اپنی مرضی سے جموڑے بنو..... ورنہ ہمیں جموڑے بنانا آتا ہے'' اس نے نظر گھمائی ڈگڈگی کو تیزی سے بجانے لگا۔

''بھائیو جموڑہ ہماری مرضی سے چلے گا، اٹھے گا، بیٹھے گا..... ہم جو دیں گے وہی لے گا..... آگے مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوگا'' وہ مسکرایا چاروں طرف نظر گھمائی، دھوتی پہنے کثیر الجسامت شخص کی طرف اشارہ کیا..... آگے بڑھ کر اس کے کان میں کچھ کہا وہ نہیں کرتے ہوئے، ہجوم سے نکل گیا۔

مداری نے قہقہہ لگایا، زور زور سے ڈگڈگی بجائی ''دھوتی والا بابو ڈر گیا..... جو ڈر گیا وہ مر گیا.....'' مداری نے کہا۔

تماش بینوں نے ایک ساتھ ہنسنا شروع کر دیا اور آواز گونج گئی

''ہاں تو بھائی جان، قدردان، ذرا سی دھمک سے ڈر جاتے ہیں، خون دیکھ کر ڈرنے کی تہذیب کو ہم اسی وقت ختم کر سکتے ہیں کہ اڑتی چڑیا کو پکڑ کر ذبح کرنا سیکھیں'' مداری نے اعلان کرتے ہوئے ڈگڈگی بجائی۔

مداری نے گھیرے کے اندار چاروں طرف گھومتے ہوئے تماش بینوں پر

نگاہیں گھمائی زور سے تالی بجائی ''ہاں تو بھائی جان'' ایک پینٹ شرٹ والے نوجوان کی جانب اشارہ کیا ''ہمیں بہادر جموڑا چاہئے .....'' میں ..... میں کی آواز ہجوم میں گونجنے لگی ایک کالی ڈاڑھی والا آگے بڑھا..... مداری نے ڈانٹتے ہوئے کہا ''ہمیں بکرا نہیں چاہئے .....ہمیں جموڑا چاہئے.....بکرا تو ہم خود بنالیں گے.....ڈاڑھی والا ڈر کر پیچھے ہٹ گیا..... ہجوم کے درمیان ناراضگی کی بھنبھناہٹ پھیل گئی..... مداری کی جانب سخت نگاہوں سے دیکھا اور مجمع چھوڑ کر چل دیا.....۔

تماش بینوں نے قہقہہ لگایا.....مداری نے آواز لگائی بچہ لوگ تالیاں بجاؤ'' قہقہہ اور تالیوں کی گونج میں مداری کا جملہ ''اگر کسی نے اپنی زمین چھوڑی تو زمین چھوٹ ہی جائے گی''..... مداری نے ڈگڈگی زمین پر رکھی اور میلے کچیلے جھولے سے پیتل کی بانسری نکالی.....منہ سے لگائی اور سریلی آواز فضا میں پھیل گئی.....کچھ لوگ کرشن کی مرلی پر جھومنے لگے اس کے سرور میں آنکھیں بند ہوگئیں..... باقی لوگ وہم وگماں لئے واپس ہوگئے..... مداری گھیرے میں گھوم گھوم کر مرلی بجا رہا تھا.....اب اس کے دائیں ہاتھ میں ڈگڈگی بھی تھی۔ مرلی اور ڈگڈگی کی آوازوں میں کوئی مناسب سنگم نہ ہونے کے باوجود ہجوم میں کھڑے تماش بین اس بے لطف منظر میں شریک ہونے کی شعوری کوشش کر رہے تھے چونکہ مداری کے خوفناک سحر میں مبتلا ہوگئے تھے۔

مداری نے اپنی فطرت کے مطابق آواز لگائی ''ہاں تو بھائی جان، قدردان، زمین پر بیٹھ جاؤ.....سب کو مٹی میں ملنا ہے راضی راضی غیر راضی'' اس نے ڈگڈگی بجانا بند کر دیا اور مرلی کو اپنے جھولے میں رکھ لی۔

''یہ مرلی نہیں صور ہے.....جو سور ہے، ہمیشہ کے لئے سو جائیں، ورنہ جبراً سُلا دیا جائے گا'' مداری نے بلند آواز میں کہا

فضا میں قہقہوں کا شور گونج گیا.....تماش بین مداری کی جانب دیکھ رہے تھے

''بڑھتی ہوئی آبادی کو کچل دیا جائے گا..... بھائی جان، قدردان آبادی کا طوفان خوفناک حدتک بڑھ گیا ہے۔ کھانے کو ہے نہیں دانے، اماں چلی بھنانے'' ڈگڈگی گھوم گھوم کر بجانے لگا، کچھ لوگ جیسے ہی چلنے کو ہوئے اس نے زور سے آواز لگائی، کہاں جاتے ہو بھائی جان..... کوئی نہیں ہے تمہارا نگہبان..... میں ہوں تمہارا قدردان..... جو ڈالے گا دان وہی بنے گا بھگوان'' بچہ لوگ زور سے تالیاں بجائیں۔

مداری نے ڈگڈگی اٹھائی اور چہار جوانب بجانی شروع کردی

آگے قطار میں کھڑے تماش بینوں نے ایک ساتھ آواز لگائی ''مرلی بجاؤ''

مداری نے جھولی سے مرلی نکالی اور ڈگڈگی رکھ دی..... مرلی کی سریلی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ اگلی قطار کے لوگ اس کے جادو میں کھو گئے، پچھلی قطار میں کھڑے لوگ مرلی کی زہریلی سُر کو اپنے جسم کی رگوں میں سرایت ہوتی ہوئی محسوس کرنے لگے جب بے رُخی سے چلنے کے لئے مڑے۔ مداری نے غصّہ سے بھرے لہجہ میں آواز لگائی ''زمین مت چھوڑو ورنہ ایسی آگ میں جھونک دیا جائے گا نہ جلو گے، نہ مرو گے..... بلکہ مرنے سے بدتر ہو جاؤ گے'' آواز جانے والوں کا پیچھا کرتے کرتے فضا میں گم ہوگئی۔

مداری نے ڈگڈگی بجائی اور آواز لگائی ''بھائی جان یہ پاپی پیٹ نہ ہوتا تو کوئی پاپ نہ ہوتا، نہ کوئی باپ ہوتا نہ بیٹا'' فضا میں قہقہے گونجنے لگے۔

''بچہ لوگ تالیاں بجائیں'' بچوں نے تالیاں بجائیں اور کھلکھلا کر ہنس پڑے

''ہنسنا بند کرو، سوچو، سوچنا ضروری ہے۔ ہمیں نوٹ چاہئے۔ ہاں تو بھائی جان، قدردان، نوٹ ہوں گے تو ووٹ بھی ہوں گے۔ پاپ ہوں گے تو باپ بھی ہوں گے.....'' مداری گھوم گھوم کر ڈگڈگی بجا رہا تھا اور قافیہ پیمائی کر رہا تھا۔

''جو چلے گئے۔ ان کو بتا دینا یا تو اپنی مرضی سے جمورے بن جائیں، نہیں تو تماش بین بنا دیا جائے گا''۔ مداری نے زمین پر چادر بچھا دی، پیٹ پر ہاتھ مارا 'جتنا بڑا پیٹ ہوگا

اتنا ہی ویٹ ہوگا اور ویٹ ووٹ سے بڑھتا ہے، پیٹ نوٹ سے بڑھتا ہے..... ہاں تو قدردان تالیاں بجائیں۔دل کھول کردان دیں اور مان کمائیں"۔

کچھ بیٹھے ہوئے تماش بین چل دیئے۔ مٹھی بھر لوگ رہ گئے۔ مداری نے اپنی چادر سمینٹی ،جھولی کندھے پر رکھی، ڈگڈگی ہاتھ میں لیکر چل دیا اس کے پیچھے معصوم بچے اور چند لوگ چلنے لگے۔

مداری کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ ڈگڈگی کی آواز پر بھیڑ جمع کرنے میں ناکام رہتا ہے لیکن مرلی کی سرتال پر قدرے بھیڑ میں اضافہ ہوتا ہے۔تمام سعی ومحنت کے باوجود وہ آمدنی اور بھیڑ کی قلت کی طرف سے فکرمند رہتا۔اس نے پیشہ کی نزاکت اور نکات پر غور وخوض کیا اپنے بزرگ مداریوں سے مشورے کئے اور اس نتیجے پر پہونچا جب تک تعداد میں اضافہ نہ ہوگا پیشہ کی لگام ہاتھ میں نہیں آسکتی۔ڈگڈگی کا کھیل فرسودہ ہوگیا اس کی آواز پر لوگوں کو بیوقوف بنانا آسان نہیں۔اس نے نئے تماشے کی جانب توجہ دی اور مرلی کی آواز پر بندر نچانے پر ریاض شروع کردیا اور جب اس کھیل کو لیکر اس نے گلی کوچوں میں چکر لگائے تو تماش بینوں کی بھیڑ میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ تماشہ کا یہ منظر کہ کرشن کی مرلی پر ہنومان ناچے" ایک نیا اور انوکھا منظر ہے۔

تماش بینوں نے اس نئے منظر کو بڑے شوق سے دیکھا اور بہت سوں نے تعریف کی۔سائنسی دور نے جو مذہبی جذبہ کی وقعت کو کم کردیا تھا وہ تروتازہ ہوگیا تھا۔یہ منظر ایسا تھا کہ تماش بین اس ادھیائے کو رامائن اور مہابھارت میں تلاش کرنے لگے۔لیکن مداری نے نئے پرانے مداریوں کی ایک ایسی جماعت بنالی تھی کہ تماش بینوں کے درمیان اس نئے منظر کو دُھرادُھرا کر رامائن اور مہابھارت کا ایک جُز بنادیا تھا اس نئے منظر کو دیکھ کر تماش بینوں کی مختصر جماعت مداریوں میں شامل ہوگئی اور کچھ لوگوں نے جموڑے بننے کے لئے سرتسلیم خم کردیا۔ مداری اور جموڑے مل کر تماش بینوں کو اپنی فطرت کے مطابق بیوقوف بناتے

رہے۔اب کوشش اس بات کی تھی کہ ایک ہیجڑوں کی سینا بنے جو تانڈو ناچے اور تماش بین خوف زدہ ہوکونوٹوں کی بارش کردیں۔تاریخ کا وہ باب ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' انہوں نے ازبر کرلیا تھا۔

مداری نے بانسری اور ڈگڈگی کے بے سرے امتزاج کی تال چھیڑی، بھیڑ جمع نہ ہوئی، پھر بانسری کی سر تال چھیڑی، تماش بین جمع ہوگئے۔ بانسری کی آواز پر بندر نچانا شروع کیا۔مگر امید کے مطابق لوگ جمع نہ ہوئے اور جو لوگ جمع ہوئے گھیرے میں کھڑے ہوگئے۔

''ہاں تو بھائی جان..... آگے والے بیٹھ جائیں..... پیچھے والوں کا دھیان رکھیں..... ہاتھ جوڑ کر ہندوؤں کو رادھے شیام، مسلمان بولیں جے سیارام..... بچہ لوگ تالی بجائیں'' بانسری اور ڈگڈگی کی ملی جلی آوازیں گونجنے لگیں..... بیٹھنے والے کسی مذہبی آہنگ میں کھو گئے۔ مداری نے بندر کو بانسری پر نچایا۔آواز لگائی'' کھڑے ہوئے بھائیوں میں سے کوئی آئے، گھیرے کے درمیان اکڑوں بیٹھ جائے''۔

کھڑے ہوئے تماش بینوں نے اپنے چہروں سے خفگی کا اظہار کیا اور چل دیئے، مداری کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔''جو دھرتی چھوڑے، وہ سودائی کہلائے..... ہمارے بزرگوں نے لڑائی لڑی، ہمیں آزادی ملی، دودھ کی نہریں بہائیں گے۔آزادی بچائیں گے خون کی نہریں بہائیں گے۔ بولو جے دھرتی کی..... بولو جے دھرتی ماتا کی'' ایک خوفناک آواز گونجی، اور فضا میں دہشت سی پھیل گئی، تماش بین سہم گئے۔ گولائی میں بیٹھے لوگوں میں کچھ لوگ خوف اور نفرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ چل دیئے۔

مداری ڈگڈگی اور بانسری پر بندر نچاتا رہا..... جانے والے تماشائی بڑبڑائے ''دھرم میں یہ نیا ادھیائے.....ایک اختراع ہے''۔

مداری نے اپنے غصہ کا اظہار اپنی جبراً مسکراہٹ سے کیا۔

مداریوں کی ایک نشست میں غور وفکر ہوا، چہار جوانب سے مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد یہ طے ہوا کہ ہیجڑوں کی سینا تشکیل دینے اور مضبوط بنانے کا جنگی منصوبہ تیار کیا جائے۔ اس نئے کھیل کے لئے ایک رتھ بنایا اس میں دھارمک تصویریں لگائی گئیں، مداریوں کی منڈلی کے درمیان مداری ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا رتھ کے پیچھے ہیجڑے تالیاں پھٹکار رہے تھے، ٹھمکے لگا کر تماش بینوں کو رجھا رہے تھے، نگہبان دونوں اطراف قطاریں بنائے، ہیجڑوں کی عصمت کی حفاظت کی خاطر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

ہیجڑوں کا قافلہ ناچتے گاتے ٹھمکے لگاتے فحش بیانی کرتے آگے بڑھ رہا تھا ،مداری نے آواز لگائی ''ہاں تو بھائی جان، یہ ہیں ہمارے نگہبان..... شمال سے جنوب تک مشرق سے مغرب تک ہماری دھرتی، ہماری کھیتی..... بچہ لوگ تالیاں بجائیں''۔

ہیجڑوں نے تالیوں کی تال پر ٹھمکے لگائے۔ تماش بینوں کی بھیڑ بڑھتی گئی، ہیجڑے تانڈو ناچتے رہے..... مداری ڈگڈگی بجاتا رہا..... دھرتی آنسوؤں اور خون سے گیلی ہوتی رہی تماش بینوں کی جیبیں خالی ہوتی رہیں، گلے کٹتے رہے..... جان بچانے کے لئے جانوں کی بازیاں لگاتے رہے.....

''ہاں تو بھائی جان..... تماش بینوں کو سبق سکھانا ہے، جب تک جموڑے نہیں بنیں گے..... ہیجڑے آتنک پھیلاتے رہیں گے'' مداری نے ڈگڈگی زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔

چاروں طرف خوف و ہراس کے بادل چھا گئے..... تماش بین مداریوں کی جانب مایوس نظروں سے دیکھتے، کبھی جموڑوں پر مترحم نگاہیں ڈالتے، ہیجڑوں سے جان و مال کی بھیک مانگتے مگر نراش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مطمئن ہو جاتے۔

''جموڑے نہ بننا خود آتنک کو بڑھاوا دینا ہے، جو جموڑا نہیں وہی آتنک وادی ہے'' مداری کی آواز گونجی۔

تماش بین چونک کر مداری کو دیکھنے لگے۔ایک تماش بین نے ہمت سمینٹ کر کہا ''اس طرح آتنک سے آتنک ختم کرنے کے لئے یہ دھرتی آتنک سے بھر جائے گی''۔

مداری غصّہ سے تلملا گیا اور آنکھوں سے اشارہ کیا ''تماش بین وہیں ڈھیر کر دیا گیا'' یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا، منڈلی چاروں دشائیں گھومتی رہی..... ہیجڑوں کی اکثریت بڑھتی رہی اور مداریوں کی ٹولی اقلیت میں آ گئی.....۔

مداری شش و پنج میں آ گئے۔ایک نامعلوم خوف کے بادل سر پر گھر آئے، مداری تماش بینوں کو رجھانے کی کوشش میں مسلسل ڈگڈگی بجاتے رہے.....

ایک دن ہیجڑوں کو اپنی طاقت کا احساس ہو گیا اور انہوں نے مداریوں پر دھاوا بول دیا..... شیر کے منہہ جب آدم کا خون لگ جاتا ہے تو وہ شہر کی جانب رخ اختیار کر لیتا ہے..... مداریوں کے ہاتھوں سے لگام چھوٹ گئی اور اقتدار ہیجڑوں کے قبضہ میں آ گیا رتھ پر سینا براجمان ہو گئی..... ہیجڑے ہاتھ میں ڈگڈگی لئے بجانے لگے..... ''ہائے ہائے۔۔سج رہی، تیری اماں سنہری گوٹے میں..... مداریوں کی منڈلی ہائے ہائے..... کھل گئی کنڈلی ہائے ہائے.....''۔

ہیجڑوں کے تانڈو ناچ نے وقت کی رقاصہ کے قدم موڑ دیئے تھے، مداریوں کی منڈلی، جموڑوں میں بدل گئی تھی..... ل..... کن..... لیکن تماش بین کل بھی مظلوم تھے اور آج بھی مظلوم ہیں.....۔

ooo

بن باس کے بعد

صوتی گونج.....جو اپنے وجود کے لئے پریشان تھی، یکا یک ماحول صداؤں سے مرتعش ہوگیا....کہ ضرور بناؤں گا۔زمین پر اپنا ایک نائب، جمیل پری زاد اپنی برتری کے لئے بے چین ہوئے.....کیا آپ پیدا کریں گے زمین پر ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خون ریزیاں کریں گے جب کہ ہمارے وجود کے سب موسم حمد وثنا کے سرتال ہیں۔اسم اعظم کی صدا گونجی کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے اور علم دے دیا اسم اعظم نے اپنے حکم سے اپنی تخلیق کو کل اسماء کا۔اس طرح خاک وجود کے افق پر چھا گئی، لیکن خاک! خاک جو اس کی ماں تھی، خون آلود ہو رہی تھی۔وسیع وعریض نیلے آسمان کو گدھوں نے اپنے مکروہ سیاہی مائل پروں سے ڈھک لیا تھا گو کہ زمین پر اندھیرا پھیل گیا تھا۔اس کے باوجود اگی ہوئی سرخ فصلیں پھر بھی نظر آرہی تھیں۔خشک، زرد، ٹنڈ، منڈ شاخوں پر الو دیکھے گئے۔جو اپنی خوفناک آوازوں سے ٹرٹرا رہے تھے۔سرخ برہنہ شاخوں میں ہوا کے خنجر پیوست ہو گئے تھے۔سائے سایوں سے ڈر کر پناہ گاہیں تلاش کر رہے تھے۔جب اندھیرا مختصر ہوا اور گدھوں کی تعداد میں تقلیل ہوئی تو سورج کی کرنیں زمین پر کانپتی ہوئی دیکھی گئیں اور آسمانوں پر روشنی کے آثار نمایاں ہوئے اس وقت لوگ پناہ گاہوں سے نکل کر اپنی اپنی رہائش گاہوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ان کے چہروں پر ہراس کی سطریں پڑھی جا سکتی تھی، جن کی روشنائی گہری تھی اور آنکھوں میں بیچارگی کی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔قینچی

کی مانند تیز قدم سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی کالی سڑک پر چل رہے تھے.... نہیں .....نہیں دوڑ رہے تھے۔ان قدموں کے درمیان دوقدم اس کے بھی تھے جس کی آنکھیں پتھر کی ہوگئی تھیں پھر بھی بیچارگی کی نمائندہ تھیں۔ چہرہ جو سیاہ ہو چکا تھا، مریم کی سی پاکیزگی پسینہ کی صورت ٹپک رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس مختصر سفر کو طے کر رہی تھی۔ جس کا اختتام ہو نہیں پا رہا تھا بلکہ لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ بڑی کوشش کے بعد ہانپتی کانپتی وہ اپنوں میں پہنچی۔

پنچ جو پرمیشور ہیں۔ایک دو فٹ اونچے مٹی کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔اسی لئے انہیں نیچے کی ہر شے چیونٹی نظر آ رہی تھی۔ چبوترے پر ایک پرانا برگد کا پیڑ لگا تھا۔جس کے اوپر سورج ٹنگ رہا تھا۔اس میں سے چھن چھن کر روشنی چبوترے پر گر رہی تھی۔ چبوترے کے چاروں طرف بیٹھے اور کھڑے آدمیوں کے سر پر کڑی دھوپ لدی تھی۔ جسے ناتواں لوگ اپنے سرکنڈوں جیسی ٹانگوں پر سنبھالے ہواؤں کی زد پر کھڑے تھے کہ ذرا بھی ہواؤں میں تیزی آئی تو وہ گر جائیں گے..... یا ٹوٹ جائیں گے ان کو گرنے کا اتنا غم نہیں تھا چونکہ گرنا تو ان کا مقدر تھا خطرہ تو ٹوٹنے کا تھا.....پھر پنچ تو بھگوان کے سمان ہوتے ہیں اور بھگوان تو ایک ہوتا ہے اور یہ پانچ یعنی بھگوان سے زیادہ شکتی شالی.....درگائیں ایک بیل گاڑی کی آڑ میں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں .....اپنے چہروں پر گھونگھٹ کاڑھے مگر اپنے سینے پر رکھے ہوئے کالے کالے نقطوں سے بے خبر، اور نوجوانوں کی آنکھوں کے خنجروں کی نوک پر غیر محفوظ....نہیں .....نہیں.....نہیں محفوظ غیروں کی ناپاک نظروں کے سائے سے بھی۔ جانکی اپنے گھونگھٹ کی آڑ سے پرمیشوروں کو جھانک رہی تھی یا جھانکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جو حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

''چودہ دن کسی غیر مرد کے یہاں گزارنے سے بہتر تھا کہ وش پی لیا ہوتا'' درمیان میں بیٹھا پنچ اپنی بلی جیسی مونچھوں پر لیموں رکھ رہا تھا۔

جانکی کے ہونٹ پھیل گئے۔ وہ بڑبڑائی ''ہوں غیر''....وہ غیر اور اپنوں کا فرق

سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی..... میں .... میں پاروتی ہوں .... شکتی ہوں شنکر کی ..... خود شنکر نہیں ہوں.... اور شنکر تو یہ لوگ بھی نہیں ہیں پھر کیوں یہ میرے سروناش پر تلے ہیں؟ وہ اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔

''بھئی مرنا تو سب کو ہے۔'' دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے پنچ نے تیر پھینکا۔

جانکی نے تیر کی کاٹ کو برداشت کیا۔''ہاں'' میرا قصور یہ ہے کہ میں موت سے ڈر گئی..... کیوں ڈر گئی....؟ کیوں نا نیل کنٹھ کی طرح زہر اپنے گلے میں انڈیل لیا.... لیکن اگر موت شکتی پر قابض ہو جاتی تو.....؟ کیا کوئی موت سے نہیں ڈرتا؟ جب جھیر ساگر منتھن ہوا تو دیوتاؤں نے وِش پینے سے کیوں انکار کر دیا؟''

''اس کا کیا ثبوت ہے کہ جانکی پوتر ہے؟'' تیسرے نمبر کے پنچ نے کہا۔

''پر اس کا کیا ثبوت ہے کہ میں آپوتر ہوں'' جانکی نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے منہ میں کونین کی گولی آ گئی ہو، اس نے زمین پر حقارت سے تھوک دیا۔

پنچ پرمیشور کے فیصلے کے مطابق ''جانکی کو پاکیزگی ثابت کرنے کیلئے اگنی پریکشا دینی ہوگی۔''

جانکی کو محسوس ہوا کہ دریودھن نے بھری سبھا میں دروپدی کو ننگا کر دیا ہو۔ وہ سوچتی ہے مردوں نے عورت کو جنم ہی سے دھوروکیڑا میں ہارا ہوا دھن کی طرح استعمال کیا ہے۔ لیکن میرا مرد، میرا دیوتا، میرا راگھویندر گوتم رشی کیوں نہ ہوا جس کے شاپ سے اہلّیا کی طرح میں یہاں آنے سے پہلے پتھر کی طرح ہو جاتی، پھر میں بھگوان کی طرح، نہ بولتی، نہ سنتی، نہ محسوس کرتی اور نہ روتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مردوں کے درمیان راگھویندر کھڑا سوچ رہا تھا اگر جانکی اگنی پریکشا میں اسپھل ہو گئی تو کیا ہوگا؟ وہ تو آگ میں جل کر جیون مکت ہو جائیگی.... لیکن میں زندگی بھر اپنی ہی آگ میں جلوں گا۔ کیا میں جانکی کے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟ .... وہ آگ جو جانکی کو جلا کر

پاپن ثابت کریگی، پاپن تو مر جائے گی کیوں کہ بھگوان کی طرح وہ پتھر نہیں ہے۔ لیکن کیا پاپ اس کائنات سے مٹ جائے گا؟......نہیں......نہیں....قتل کی روایت کا وہ سلسلہ راون پر ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ آج تک جاری ہے.....راون ابھی مرا نہیں ہے؟ پھر اس فیصلہ اور سزا کا مطلب؟ .....پنچ پرمیشور اور یہ سنسار تسلیم کر لے کہ جانکی کی جان سلامت تو سب کچھ سلامت ہے، عزت و ذلت، احساس شرم و ندامت سب بے معنی ہو جائیں گے۔ وہ سوچتا ہے میں یدھشٹر کیوں نہ ہوا؟........مگر ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انسان سوچے کہ انار کے پیڑ میں آم نکلیں، آدمی کے سر پر ایک پتھر کی سل رکھی ہے بس وہ اسی کے نیچے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ نکل جانے کی ناکام کوشش ہی کہانی کو جنم دیتی ہے۔

فیصلے کے بعد لوگ اٹھنے لگے اور اپنے اپنے گھر آہستہ آہستہ واپس جانے لگے۔ دن سمٹ رہا تھا۔ سورج کی روشنی ہلکی ہو رہی تھی، دور مغرب میں شفق پھیل رہی تھی۔ آسمان پر پرندے قطار میں اڑ رہے تھے اور ایک پرندہ ڈار سے بچھڑ گیا تھا۔ جو پرندوں کے جھنڈ کو پکڑنے کی کوشش میں تیز رفتاری سے اڑنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ رگھو یندر تنہا اس برگد کے درخت کے تنے سے لگا کھڑا تھا۔ سوچتا ہے اس اگنی پریکشا اور جانکی کی پاکیزگی کا کیا تعلق ہے؟ اور پھر کیا پاکیزگی اور ناپاکی میں صرف چودہ دن کا فرق ہے۔ چودہ دن گھر سے غائب رہی تو جانکی ناپاک ہو گئی.....بہتر تھا مر گئی ہوتی.....رہا میرے غم کرنے کا تو فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ دنیا کے کاروبار میں کمی تھوڑئ آتی۔ معمول کے مطابق سورج طلوع ہوتا۔ کاروبار زندگی بدستور چلتا۔ سورج غروب ہوتا لوگ سوتے، لوگ جاگتے......پنچ پرمیشور کے فیصلے سب میری طرح قبول کرتے؟ انسان کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ارجن کی طرح کرشن کے کہے ہوئے پر عمل کرلے اور اپنوں ہی کے خلاف برسرپیکار ہو جائے اور میں نے بھی فیصلہ قبول کر لیا اپنی شرافت کی دلیل کے طور پر.....کل جانکی وہی عروسی جوڑا پہنے گی جو میرے گھر پہن کر آئی تھی اور اگنی کو شا کچھی مان کر قسم کھائی تھی کہ اس دہلیز سے سفید

جوڑا پہن کر ہی نکلوں گی۔لیکن یہ کیسی بغاوت ہے۔کیا ریت، روایت، پریت سب ہی کچھ بھول گئی ؟اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اسے سب ہی کچھ دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا۔اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں، اندھیرا پھیل چکا تھا۔وہ برگد کی شاخ پکڑے کھڑا تھا اس نے اپنے آپ سے کہا" رفاقت اور فرقت مین صرف ایک رات کی تفاوت ہے ۔اس رات کے بعد، میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا.....جانکی ان کالے کالے بادلوں میں ڈوب جائے گی پھر اندھیرا اور سیاہ راتیں میرے حواس پر سوار رہیں گی۔راتیں سانپ بن کر ڈسیں گی۔میری رگوں میں زہر گھولیں گی۔وہی لوگ رہیں گے، پنچ پرمیشور رہیں گے، قریب بہنے والی ندی اسی طرح بہے گی۔آموں کے پیڑوں پر بور آئے گا، فصلیں اگیں گی، سب کچھ یوں ہی باقی رہے گا۔" اس نے ایک نگاہ آسمان پر دوڑائی۔رات بالکل ویسے ہی ہے جیسی چودہ دن پہلے تھی۔جانکی بالکل ویسی ہے جیسی چودہ دن پہلے تھی۔پھر تبدیلی کس بات میں آئی ؟ہاں جانکی کا قصور یہ ہے کہ اس نے جان بچائی۔لیکن کیا جان بچانے کا مطلب اگنی پریکشا ہے؟اس نے جھٹکے سے اس شاخ کو توڑ لیا جسے پکڑے کھڑا تھا اور پنچ پرمیشور کی جاہِ نشست پر پڑے پتھر پر اس زور سے ٹھوکر لگائی کہ وہ دو گز دور جا پڑا۔پنجہ مین چوٹ لگنے سے وہ کراہ اٹھا اسے لگا جیسے پتھر نے پنچ پرمیشوروں کی کمروں کو توڑ دیا ہو۔بالکل اسی طرح جیسے دروپدی کے اپمان پر بھیم نے دریودھن کی جانگھ توڑ دیا تھا۔اس کو سکون ہوا.....رات کے اندھیرے میں ہر چیز صفر نظر آرہی تھی اس نے سوچا زندگی میں بھی تو ہر چیر تقسیم ہوگئی ہے اور باقی صرف صفر ہی رہ گیا ہے حالانکہ گوتم طدھا کو گرہست سنسار تیاگ کرنے پر روشنی پر پت ہوئی تھی، مگر مجھے جیون تیاگ کرنے پر اندھیرا؟ چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا، ایک خوفناک پراسرار اندھیرا۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے گھر پہنچا۔گھر میں چودہ دنوں سے چراغ نہیں جلا تھا۔ آج پندرہواں دن تھا۔جبکہ چودہ دن بن باس کے بعد گھر میں چراغاں ہونا چاہئے تھا،

مہالکشمی کی پوجا ہونی چاہئے۔اسے اچھی طرح یاد ہے۔جانکی کے غائب ہونے سے پہلے اس رات آسمان پر پورا چاند تھا اور چکور اس کے گرد گھوم رہا تھا۔اسے کیا معلوم تھا؟ کل سے چاند گھٹنے لگے گا اور رفتہ رفتہ گھٹتے گھٹتے بالکل غائب ہو جائے گا۔نہیں ....نہیں چاند پھر ابھرے گا۔ہر شے ابھرنے کے لیے ڈوبتی ہے اور پنر جنم کا یہ سلسلہ دائروں کی طرح کائنات کے اس سمندر میں پھیلتا رہتا ہے.....میرا چاند بھی ابھرے گا۔مگر اس کی پہچان کیا ہوگی؟ چاند جب ڈوب کر ابھرتا ہے تو کتنا باریک ہوتا ہے! کتنا فرق ہوتا ہے ڈوبنے کے بعد ابھرنے میں !اس نے دائیں ہاتھ بچھی چارپائی پر نظر اٹھائی جو خالی تھی۔جس رات جانکی غائب ہوئی تھی،اس رات گھر شمشان ہو گیا تھا۔چاروں طرف خاموشی کے درمیان صرف میں تھا اکیلا،تنہا،ایک بھوت کی طرح۔ہر شے مجھ ہی سے شروع ہو کر مجھ ہی پر ختم ہو رہی تھی اور اب چودہ دن بعد خط مستقیم کا وہ دوسرا نقطہ ملا بھی تو اس کی سمت خط منحنی کی طرح مڑ گئی۔ نہیں.....نہیں۔۔۔۔۔۔موڑ دی گئی۔میں نے کب انصاف مانگا تھا؟ پھر کیوں انصاف دیا جا رہا ہے؟ جانکی بری ہے بھلی ہے میرے لیے ہے پھر دنیا میں کون اچھا ہے؟ اور کون برا ہے؟ گناہوں کی صلیب آدم سے لے کر جانکی تک ہر ایک اپنے کاندھے پر لئے گھوم رہا ہے۔پھر ہابیل اور قابیل جو ایک ہی پیٹ کے تھے عورت کی خاطر ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔اس کا علم انہوں نے دو کوؤں کی جنگ سے لیا۔ایک کوا لہولہان ہو کر مر گیا تو دوسرے نے پنجوں سے زمین کھود کر اسے دبا دیا۔کوے نے بھی اتنا ہی کیا جتنا اس کو علم دیا گیا تھا۔پھر قصور کس کا ہے سامنے بائیں جانب ایک کونے میں ایک کنکر کے نیچے کوکروچ پھڑ پھڑا رہا ہے۔پھر جس گناہ کی پاداش میں وہ آگ میں جلے گی تو کیا جلنے سے اس کی عزت واپس آجائیگی؟....نہیں.....نہیں.....کتنے پاگل ہیں یہ لوگ،جان ہے تو عزت و ذلت ہے،ایمان ہے جہان ہے۔اور گر جان نہیں تو ایمان کا کیا مطلب؟ پھر اس میں جان کا کیا قصور؟ قصور ان کا ہے جنہوں نے جانکی کا ایمان غصب کیا؟.....نہیں.....نہیں اندر آج

بھی اِندر ہے، دیوتاؤں کا راجہ۔ قصور تو اہلیا ہی کا ہے.....؟

''بے شک.....بے شک'' پنجرے میں قید طوطے نے کہا۔

راگھویندر کی نظر پنجرے پر گئی جو جھونپڑی میں لگے ڈنڈے پر لٹک رہا تھا اور طوطا ادھر سے ادھر ٹیں ٹیں مٹھو بیٹا.... مٹھو بیٹا کر رہا تھا۔

''ہاں تو ہی میرا ہمدرد ہے'' اس نے کہا.....وہ یہ بھول گیا تھا، طوطا مٹھو بیٹا کے علاوہ کہہ کیا سکتا ہے؟ طوطا اتنا ہی جانتا ہے جتنا اس کو علم ہے، اتنے ہی اسماء جانتا ہے جتنے اس کو بتائے گئے ہیں، وہ مفاہیم اور معنی سے بے خبر ہے.....راگھویندر کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں... سوچتا ہے کتنی عجیب سی بات ہے انسان جان بچا کر بھاگنا بھی چاہتا ہے، پھر بھی عزت و ایمان کو جان سے بڑا گردانتا ہے۔''

''بے شک.....بے شک'' طوطے نے سر ہلایا۔

''ہاں.....ہاں'' راگھویندر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بے شک.....بے شک.....مٹھو بیٹا'' طوطے نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

کل سورج نکلے گا اس کی پہلی کرن جانکی کی موت کا پیغام ہوگی۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے ہیں اور رات کی سیاہی آہستہ گھل گھل کر ہلکی ہو رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں نیلے آسمان کا مشرقی ٹکڑا سرخ آلود ہو گیا۔ لوہے کے ایک تار پر جانکی نٹ کا تماشہ کرے گی۔ جائے مقتل پر تماش بین جمع ہو رہے تھے پنچ پرمیشور برگد کے نیچے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہونٹوں پر بے رحم ہنسی کے نقوش صاف دکھائی دے رہے تھے۔ دور کھڑی جانکی اس آگ کے منظر کو دیکھ رہی تھی جس کا وہ خود ایندھن بنے گی۔ چند لوگ اگنی کے چاروں طرف روایت کے مطابق لہک لہک کر ناچ رہے تھے اور اپنی مخصوص آوازوں میں مذہبی گیت گا رہے تھے جن کے الفاظ جاہ و جلال اور عبرت ناک معنی دے رہے تھے۔ آگ کے بلند

شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ آگ جلتی رہی.... رقص ہوتا رہا.... ڈھولک پر پڑنے والی ضرب تیز ہوتی رہی.... اگنی پریکشا ہوتی رہی..... ناچ .... تھاپ.... اگنی پریکشا... ...سپھلتا.... کامیابی..... کامرانی دیکھنے والوں نے تالیاں بجا دیں تماش بین خوش ہو گئے..... پنچ پرمیشوروں کے چہرے اتر گئے جیسے مہابھارت میں کورووں کے جب بڑے بڑے ویر مارے گئے.... اور یدھیشٹر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی ٹھیک اسی وقت بھیشم پتامانے کہا یدھشٹر تمہاری وجے اس لئے ہوئی کہ ''تیو دھرم تنو جے'' (جہاں دھرم ہوتا ہے وہیں وجے ہوتی ہے) راگھویندر چونک گیا اس کی آنکھوں میں سپھلتا کے آنسو آ گئے.... اس نے تیزی سے بڑھ کر جانکی کو باہوں میں بھر لیا، جانکی اس کی باہوں میں اس طرح گر گئی جیسے بھیشم پتاما شرشیا پر پڑے ہوں۔ راگھویندر جانکی کو لے کر گھر چلا گیا۔ برگد کا پیڑ سنسان ہو گیا، چبوترے کے سامنے نمرود کی لگائی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو گئی، آسمان پر بادل شیر کی طرح دہاڑنے لگے، بجلی کڑکی، خوب بارش ہوئی، لوگ مست ہو گئے اہلیا دوبارہ پتھر سے انسانی گوشت و پوست میں تبدیل ہو گئی۔ چاروں طرف خوشیوں کے سنکھ بجنے لگے۔

.....

جانکی کا دوبارہ جنم ہوا جیسے انسان پرانے کپڑے تیاگ کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ہر روز نیا دن آتا ہے، آنے لگا۔ زندگی پھر لوٹ آئی تھی جیسے یم راج نے ساوتری کی تپسیا سے خوش ہو کر ستیہ وان کو لوٹا دیا تھا۔ حالانکہ تماشہ ختم ہو گیا مگر زندگی کا تماشہ جاری تھا ۔کائنات کی اسٹیج پر..... ہر دن اس ڈرامہ کا نیا سین ہوتا ہے، ڈراپ ہوتا ہے اور اس طرح قبائے حیات شب و روز کی چھڑی پر لپٹ رہی تھی اچانک اس لباس پر سکڑن آ گئی جب بھری چوپال میں کلوا نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تھا ''بتا سالی ایک رات تو کہاں غائب رہی؟ یہ نہ سمجھنا کہ سب لوگ راگھویندر کی طرح عورت کے بھگت ہو گئے ہیں۔''

راگھویندر کے پیروں تلے زمین نکل گئی، اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں،

پیشانی پر بل پڑ گئے۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ کر کیا سکتا تھا۔ بے بسی کے عالم میں جب اس رات وہ گھر لوٹا..... جانکی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جانکی کو اس قدر مارے کہ چودہ دن کا بدلہ لے لے جو آسیب کی طرح اس کی زندگی سے چپک گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ چودہ دن زندگی سے خارج کر دیئے جائیں؟..... لیکن ایسا ہو نہیں سکتا..... اس کا جی چاہا کہ جانکی کو اپنی زندگی سے نفی کر دے تو سب جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ پھر نہ کوئی زندگی کا حساب لے گا اور نہ ہی چودہ دن کی ضرب و تقسیم کرے گا۔ وہ آہستہ آہستہ جانکی کی طرف بڑھا.....

''ٹیں.... ٹیں..... مٹھو بیٹے''

وہ چونک گیا۔ جانکی کی آنکھیں کھل گئیں اس نے راگھویندر کو اپنے قریب کھڑا دیکھا۔

''کیوں، کیا بات ہے؟'' جانکی بستر پر لیٹی تھی۔

راگھویندر اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا اور کچھ نہیں کہا۔ اس کا جی چاہا کہ کلوا کا سر توڑ دے..... مگر وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔

''دل چاہتا ہے کہ آگ لگا دوں اس انصاف کو، اخلاق کی دھجیاں اڑا دوں، سماجی قدروں کو توڑ دوں'' اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا..... اس کی آواز جھونپڑی میں پھیل گئی۔

جانکی فوراً ہی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہوا..... میں نے کیا کیا؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے'' جانکی نے کہا

''بے شک..... بے شک'' طوطے نے کہا۔

''سچ سچ مٹھو بیٹے تم ابھی تک سوئے نہیں'' جانکی نے کہا۔

''بے شک .... بے شک ..... مٹھو بیٹے ٹیں ٹیں ...... مٹھو بیٹے'' طوطے نے کہا۔

راگھویندر کی نظر پنجرے کی سنخ چوں پر گئی جو سنہری رنگ میں رنگے تھے۔ جس میں طوطا ادھر ادھر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اچانک بجلی کی سرعت کے ساتھ وہ چارپائی سے اٹھا اور پنجرے کا دروازہ کھولنے لگا...... جانکی پنجرے کی طرف دوڑی ''ارے.... رے..... رے ..... '' طوطا آزاد ہو چکا تھا اور دور آسمان کی وسعت میں ڈوب گیا۔ جانکی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیا کیا آپ نے؟''

میں نے طوطے کو آزاد کر دیا۔ اب یہ رٹے ہوئے الفاظ نہیں بولے گا ۔۔۔۔ اب یہ اپنے فطری انداز میں زندہ رہے گا، جہاں چاہے گا بیٹھے گا........ جہاں چاہے گا اڑے گا۔'' جانکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

راگھویندر نے جانکی کے آنسو پونچھے، اسے قریب کیا۔ ''اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا تم کو مجھ سے چھین لے، میں تم کو تم سے چھین لینا چاہتا ہوں۔''

رنگ بدلتے آسمان تلے اندھیرے کا کالا رنگ پھیکا ہو رہا تھا اور نئی روشنی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

OOO

وہ اور پرندہ

یہ کہانی وہ کی ہے۔ وہ کی تخلیق ایک قطرے میں پوشیدہ تھی ۔جس نے قطرے سے سمندر تک کے سفر میں نہ جانے کتنے سورجوں کو چڑھتے دیکھا اور پھر ان کو اترتے دیکھا ۔یہ سفر جو یگوں پر مشتمل ہے آج بھی جاری ہے اسی سورج دکو پانے کی جستجو میں جو اس تنگ و تاریک مقام سے شروع ہوا تھا جہاں اس کی خوراک گندہ خون تھی اور برہنگی اس کا لباس تھی اب جب کہ وہ بالباس ہو گیا ہے، باشعور ہو گیا ہے۔ (ابھی بے لباسی بے شعوری سے اس کا رشتہ نہیں ٹوتا ہے، بلکہ دائروں کی طرح ، یہ سفر، مسلسل سفر، قطرے سے سمندر کا سفر، بے کراں لہروں کا سفر بے پایاں طوفانوں کا سفر، یگوں کا سفر، قرنوں کا سفر، ابھی مسلسل جاری ہے رنگ بدلتے اس آسمان کے نیچے) مگر پھر بھی اس کا اندھا سفر جاری ہے۔ وہ چل رہا.....

تھکا ماندہ سورج نے پرندے کی طرح اپنے پر سمیٹ لئے اور وہ کائنات جو کچھ دیر پہلے ست رنگی تھی، یک رنگی ہو گئی ہے۔

پرندہ نے اپنے پر پھڑ پھڑانے شروع کر دیئے۔

اب وہ قدم جو سڑک پر چل رہے تھے اچانک بلیک نائٹ بار کی طرف مڑ گئے جو روشنی سے معمور ہے۔ کڑک کا رک کھولی گئی۔

''وہ'' نے اپنی ناک سکیڑ لی ''اف کتنی!''

پرندے نے ایک آنکھ بند کی اور گردن کو ہلایا

''نہیں.....نہیں یہ بری ہے، اس کی ممانعت ہے''

''یار ممانعت تو اس بات کی بھی ہے کہ سڑک پر تیز نہ چلو چونکہ اس سے دھمک ہوتی ہے اور مرنے کے بعد زمین کو زبان مل جائے گی جو رو رو کر فریاد کرے گی۔ اول تو قبر ہی تمہارا کچومر نکال دے گی۔''

''جب کہ بھاگا نہ جائے تو زندگی کو پکڑنا بھی دشوار ہو جائے گا'' اس نے متحیر ہو کر کہا۔

''زندگی !!!.....سٹی بس پکڑنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ بلکہ ذرا بھی ست روی اختیار کی گئی.....تو پھر، پھر تو آدمی قبر میں سفر طے کرتا ہے۔''

اچانک بار کی روشنی چلی گئی۔ رنگ برنگ کے لباس، سفید اور نیلے رنگ کی چھتیں منقش دیواریں، رنگین کھڑکیاں، سب کی سب ایک ہی رنگ میں تبدیل ہو گئیں، مختلف چہرے، اکائی میں متغیر ہو گئے اور خاموشی کی شائیں شائیں نے پنجہ گاڑ دیئے وہ گھبرا گیا محسوس ہوا جیسے بار تنگ و تاریک ہو گیا ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں پسلیوں میں اور بائیں پسلیاں دائیں پسلیوں میں پیوست ہو گئی ہیں اور ۷۰ ستر گز کے کالے بدنما ناگ نے گردن پکڑ لی ہے اور کسی راکھشش کے ہاتھ میں ۷۰ ستر گز کا گرز مارنا ہی چاہتا ہو.....بتا جلدی من ربک.....ماد ینک.....من.....ما.....ربک.....دینک؟

''نہیں.....نہیں.....ن..ہ....ی.....ں''

''اگر بھاگتی ہوئی زندگی سے چند لمحات مسرتوں کے چرا لئے جائیں وہ پوری زندگی پر بھاری ہوتے ہیں۔ اور پھر تم.....تم تھکے ہوئے بھی تو ہو.....آخر اس کا علاج ؟'' پرندے نے اصرار کیا۔

''قل.....قل.....قل....ل....ل....قل''

غٹ.....غٹ.....غ....غ....غٹ''

خاموشی پگھل رہی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ رنگین ہو رہا ہے۔ اس کا پسینہ پیشانی سے رخسار کی طرف بہہ رہا ہے، اس نے رومال سے ہونٹ صاف کئے۔ وہ کھڑا ہو گیا کھڑ کھڑ.....کھڑ کمرے میں گونج گئی۔

اب وہ اس طرح چل رہا ہے جیسے سڑک بال سے زیادہ باریک ہو اور تلوار سے زیادہ تیز دھار رکھتی ہو۔ دائیں طرف پان شاپ پر رک گیا جہاں ایک آدمی سگریٹ خرید رہا ہے۔

''بھائی صاحب.....ایک .....ک ۹۵ پچانوے نمبر کا .....کا ..... پان'' اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

دوکان پر کھڑے آدمی نے اوپر کی سانس لی اور ناک سکیڑ لی۔

''لو''

اس نے منہ میں پان رکھ لیا.....اور سڑک پر اس طرح چلنے لگا جیسے نٹ تار پر چل رہا ہو۔ ہر قدم کو ناپ تول کر رکھ رہا ہو کہ غلط قدم رکھا اور نیچے گرا.....وہ سوچتا ہے کیا میں گر گیا؟ اور اگر گر گیا ہوں تو سنبھل سنبھل کر چلنے کی ضرورت؟.....نہیں.....نہیں مجھے اسی طرح چلنا چاہئے۔ کیوں کہ پان کی دوکان پر ابھی تو ایک آدمی ملا ہے.....اور.....راستہ ابھی بہت طویل ہے۔ ناک سکیڑنے والوں کی کمی نہیں۔ پھر اس خوشبو کے پان کا کیا مطلب؟

''لیکن تم گھبراتے کیوں ہو؟ فضا اس لئے رنگین ہوئی کیونکہ تمہاری پھولی ہوئی جیب سکڑی اور اگر لوگوں کی ناک سکڑی ہے تو یہ ان کی جیب خالی ہونے کا ردّ عمل ہے'' پرند کا دلاسہ۔

اچانک اس کی بائیں آنکھ میں کیڑا آ کر گرا، وہ تلملا گیا اور جلدی جلدی آنکھ میٹرنے لگا اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اس نے آنکھ صاف کی اور بالوں کو اوپر جھٹکا دیا۔

راستہ میں نظر دوڑائی، اندھیرا اجاڑے سے کانپ رہا ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال لئے۔ پل صراط جیسی سڑک کو عبور کر لیا تھا اور اس کمرے میں اپنے بوجھل قدم کو رکھا جس میں گورستان جیسی خامشی طاری تھی جو اسرافیل علیہ السلام کی دوسری صور کا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں اس کی مسہری بائیں ہاتھ پہ بچھی تھی اور دروازے کے صحیح سامنے ایک چارپائی تھی جس کا سرہانہ دائیں طرف تھا۔ اس کے ذہن میں آگ سی لگ گئی۔

''اس میں سرخ ہونے کی ضرورت کیا ہے؟ اگر مسہری کے قریب چارپائی نہیں بچھی کیا ہوا؟'' پرندے نے سمجھایا۔

اس نے ضبط کر لیا۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ قریب ہی دائیں جانب سنگار ٹیبل پر ٹائم پیس کی کٹ... کٹ..... کٹ کی آواز..... اس کی ایک آنکھ گھڑی پر دوسری رسٹ واچ پر، دائیں ہاتھ سے فیتہ کھولا اور رسٹ واچ سنگاردان کی ڈرار میں رکھی۔ کپڑے تبدیل کئے اور کرتا پائجامہ پہن کر لحاف میں داخل ہو گیا۔

اس نے چارپائی پر لیٹی ہوئی بیوی کو آنکھ کا اشارہ کیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی ''آج موڈ ہو رہا ہے''

''موڈ۔ ووڈ کچھ نہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور سو جاؤ۔''

اس کے ذہن کی تمام آگ ہونٹوں پر سمٹ آئی ''مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ تم ذرا بھی میرا خیال نہیں رکھتی ہو۔''

''کیسا خیال؟ آپ کے لئے روٹیاں پکاتی ہوں، گھر سجاتی ہوں، کپڑے دھوتی ہوں۔ آپ کے بچوں کی پرورش کرتی ہوں۔''

''کیوں تمہارے بچے نہیں ہیں؟ اگر روٹیاں پکاتی ہو تو کیا میں کمائی نہیں کرتا؟''

''میں نے کب انکار کیا؟''

''تم..... تم..... میرا انتظار نہیں کرتی ہو۔ کیا زندگی روٹیاں پکانے، گھر سجانے،

کپڑے دھونے بچوں کی پرورش کرنے تک محدود ہے؟''

''اس سے آگے ہے بھی نہیں''

''تم جاہل ہو''

''کھسیانی بلّی کھمبا نوچے''

اس کی پیشانی پر رگیں تن گئیں اور آنکھیں سرخی میں ڈوب گئیں وہ مسہری کے سرہانے کمر لگا کے بیٹھ گیا اور چیخوف کی کہانی ''دشمن'' کے مطالعہ مین مصروف ہو گیا۔ وہ رات کے مختصر مطالعہ سے ہمیشہ Sleeping Tablet کا کام لیتا ہے۔ لیکن آج کی رات روز محشر بن گئی ہے۔ نہیں نہیں.....اپنی صحت.....روٹی کپڑا بچے.....کھسیانی بلی.....نہیں نہیں.....اپنی صحت.....کل ملا کر سامان شب حشر بن گئے۔

کمرے میں سکوت طاری ہے، دیواریں تابوت کی طرح کھڑی ہیں، باہر رات کی جسامت پر کتوں کی بھوں.....بھوں.....بھوں رینگ رہی ہے.....وہ سوچتا ہے زندگی ایک رات ہے.....رات ایک اندھیرا ہے۔ اور اندھیرا ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت میں وہ ایک کرن پانے میں سرگرداں ہے جیسے برسات کی ڈراؤنی رات میں بھٹکے ہوئے مسافر کو بجلی کی معمولی سی چمک بھی راستہ دکھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

وہ اچانک گھٹ کر اپنی عمر سے پچیس سال چھوٹا ہو گیا ہے۔

صحن میں چارپائی بچھی تھی، آسمان پر چاند لگا تھا۔ دادی اسے گود میں لئے اچھال رہی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ اٹھا اٹھا کر چاند پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا....لیکن افسردگی کا احساس بار بار اس کے چہرے پر آجاتا۔ ''دادی وہ چاند میں تون بیٹھا ہے؟''

''بیٹے ایک بڑھیا چاند کی گود میں ہے''

''پر دادی تم تو مجھے دود میں لئے بیٹھی ہو''

''ہاں بیٹے میں اپنے چاند کو گود میں لئے ہوں''

''دادی میں تمہیں تب دودھ میں لوں گا''

''بیٹے جلدی بڑے ہو جاؤ'' دادی نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

وہ سوچتا ہے چاند آج تک میرے ہاتھ نہیں لگا۔ ابھی تک اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا پہلے تھا حالانکہ میں بڑا بھی ہو گیا اور دادی..... دادی تو کب کی بادلوں میں چھپ گئی۔

''دادی میں تب براہوں دا''

''بیٹے خدا سے دعا کرو''

''اے کھدا مجھے جلدی..... جلدی برا کر دے''

اور میں بڑا ہو گیا..... لیکن..... لیکن اتنا بڑا ہو گیا کہ میری ماں چھوٹی ہو گئی وہ تو صرف پچیس سال کی عمر میں دادی کے پاس چلی گئی اور اس وقت میں اس سے پانچ سال بڑا ہوں اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

پرندہ مسکرانے لگا تم شاید بھول گئے میں نے کہا تھا ''بھلا رونے سے کوئی لوٹ آتا ہے۔ تمہیں یاد ہو تمہاری ماں کفن اوڑھے دالان میں لیٹی تھی کافور کی بو چاروں طرف پھیل رہی تھی اور دیوار کے سوراخ میں لگی اگر بتیوں کی خوشبو اس میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔ پڑوس کی عورتیں چارپائی کے اردگرد بیٹھی تھیں رشتہ کی عورتیں رو رہیں تھیں، لیکن تمہاری ماں کا مرد دور دور خاموش نظر آ رہا تھا۔ اسے دور رہنے کی سزا اس لئے دی گئی تھی چوں کہ اس مرد نے مرحومہ کے ساتھ زندگی کے گیارہ سال گزارے تھے (اور اگر گیارہ گھنٹے بھی گزارتے ہوتے) تو بھی یہی سزا ہوتی کیوں کہ اس نے نکاح کیا تھا؟ اور وہ عورت جو بے نکاح تھیں اس نے تمہارے باپ کی گود میں دم توڑا تھا۔ اس عورت کی گود میں ایک لڑکا ہے جس کی تخلیق میں تمہارا باپ بھی شامل ہے۔ مرتے وقت اس نے وعدہ لیا تھا ''اس محبت کے پھول کی پرورش تم اپنے یہاں کرو گے تا کہ اسے باپ بھی مل سکے'' (مگر تمہارے باپ شریف آدمی تھے۔ دراصل ہر باپ شریف ہوتا ہے) پرند نے طنز کیا۔

''تم الزام لگا رہے ہو؟'' اس نے غصہ میں کہا۔

''ہاں وہ تمہارے باپ ہیں اس لئے ان سے کوئی غلطی ہونے کے امکان نہیں ''پرند کا طنز۔

اس نے کہا'' بکومت'' وہ سوچتا ہے اگر ایسا ہوا بھی ہے تو کیا وہ میرے ساتھ رہ سکتا ہے۔ چلو میں رکھ بھی لوں تو لوگ انگشت نمائی کریں گے۔ یہ مجھے برداشت نہیں ہوسکتا۔ اف کتنی بے عزتی کا مقام ہے.....نہیں .....نہیں۔''

''تم اسے رکھنے میں ذلت محسوس کر رہے ہو۔ ذرا اس کے دل سے پوچھو، جب کہ اس حادثہ میں اس کے فعل کو ذرا بھی دخل نہیں۔ اس کی تخلیق اتفاقیہ ہوئی ہے۔ جس طرح تمہاری ہوئی ہے اور سب کی ہوئی ہے... فرق صرف اتنا ہے کہ وہ چند بولوں (اشلوکوں) سے پہلے پیدا ہو گیا اور تم بعد میں'' پرند نے گردن ہلائی۔

''اف.....میں کیا کروں؟'' اس نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

''میرا یہ مدعا نہین کہ تم شرمندہ ہو نہ ہی تمہارے باپ کی غلطیوں کا شمار کرنا مقصد ہے اور نہ ہی مجھے یہ شکوہ ہے کہ انہوں نے کیوں غلطی کی؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ مجھے عزت ذلت، شرمندگی، من گھڑت اصطلاحیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ اصطلاحیں'' جامد''نہیں ہیں، یہ بات میں تاریخی اور سماجی پس منظر میں کہہ رہا ہوں۔ اصل میں ہر شخص کی زندگی کے مختلف حادثات کے تحت ان کے معنی بدل جاتے ہیں اور نہ صرف یہ تمام دنیا میں مختلف مقامات پر رہنے والے تمام انسانوں کے سامنے ان کی مختلف تہذیب وتمدن کے سبب اس کے الگ معنی خیال کئے جائیں گے اور لغت مین ان کے ایک ہی معنی نکلتے ہیں'' پرند نے دلیل پیش کی۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا''

''میں سمجھاتا ہوں یہ جو تمہارے دائیں ہاتھ کو میز رکھی ہے اس کو ہم اس لئے میز کہتے ہیں چوں کہ اس کو ہمارے بزرگوں نے میز کہہ دیا اور اگر ہم اس کو کوئی دوسرا نام دینا

چاہیں (جب کہ حق حاصل ہے) مگر ہم نہیں دے سکتے بلکہ قاصر ہیں'' پرند نے مزید دلیل پیش کی۔

اس نے مسہری کے قریب بچھی میز پر نظریں جمادیں جس پر کتابوں کا ڈھیر ہے جو اسے دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔

''آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' بیوی نے کہا

''نہیں.....نہیں راستہ میں کیڑا گر گیا تھا'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''نکل گیا؟'' بیوی نے پوچھا۔

''ہاں، لیکن کسک ابھی تک باقی ہے'' اس نے کہا۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا۔ قدرے گردن جھکا لی اور آنکھیں بند کرلیں وہ سوچتا ہے ہر دن لمحوں میں تقسیم ہوتا ہے اور ہر لمحہ ایک حادثہ ہے۔ سب کچھ بھولنے کے باوجود وہ لمحہ جو اس لمحہ خود ایک حادثہ بن گیا ہے اس رات کے لئے۔

اس وقت سہ پہر تھی سورج رفتہ رفتہ ڈوب رہا تھا لوگ اپنی گھڑیوں میں بار بار وقت دیکھ رہے تھے، ڈاکٹر کے ہاتھ میں نبض تھی، ماں کی آنکھیں کھلی تھیں جو آسمان کو تک رہی تھیں پتہ نہیں خدا کے پاس جانے کی خوشی تھی.....نہیں نہیں دنیا چھوڑنے کا غم۔ چھوٹی بہن پلنگ کے قریب تھی میں سورہ یٰسین کی تلاوت کررہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔ ہچکیوں کا ایک طویل سلسلہ ''غیں.....غیں.....'' اچانک سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی ''لا الہ الا اللہ'' ایک بلند آواز گونجی ۔ اور پھر رونے کا ایک شور .....ہاں ہا.....ایں ایں .....آں.....آں۔

''آپ آنکھوں میں سرمہ لگا لیجئے'' بیوی نے مشورہ دیا۔

''ہیں۔ ہاں اسقدر ٹی بی کا بوجھ اٹھانے کے باوجود اس کو زندہ رہنے کی اس قدر خواہش کیوں تھی؟'' اس نے چونک کر کہا۔

''کیا.....کیا کہہ رہے ہیں آپ'' بیوی نے متحیر ہوکر پوچھا۔

''ہاں.....سب جانتے ہیں۔ کلّ نفس ذائقته الموت پھر زندگی سے اتنا پیار کیوں؟''

زندگی بڑی حسین شے ہے۔انسان کو اس کی قدر کرنی چاہئے۔'' پرند نے گفتگو جاری کی۔

''اچھا خاموش ہو جاؤ۔ جتنا زندگی سے انسان کو پیار ہوگا۔آدمی موت سے اتنا ہی ڈرے گا۔اور پھر زندگی کیوں کر حسین ہو سکتی ہے جب کہ اس کے دامن پر موت جیسا بھیانک دھبّہ لگا ہے'' اس نے جواب دیا۔

''وہ تو آنی ہے مگر پھر بھی اپنی تمام تر بدصورتی کے درمیان بھی حسین ہے کنول کی طرح''

''بات یہ نہیں۔انسان زندگی کی تضحیک بھی کرتا ہے، اور زندہ رہنا بھی چاہتا ہے۔لیکن کیوں؟''

''زندگی کی تضحیک نہیں، بلکہ حالات کی تضحیک کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حالات کے مطابق ہی وہ زندگی کے بارے میں مثبت یا منفی نظریہ قائم کرتا ہے'' پرندہ نے عالمانہ گفتگو کی

وہ کچھ قائل سا ہو گیا اور خاموش ہو کر کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔اس نے ٹائم پیس کو دیکھا چھوٹی سوئی دس کے ہندسے پر بڑی سوئی بارہ کے ہندسے پر زاویہ حادہ بنا رہی تھی۔

''آپ سو کیوں نہیں جاتے؟'' بیوی نے کہا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم سو جاؤ''

مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی''

''لیکن مجھے اندھیرے سے گھبراہٹ ہوتی ہے'' اس نے کہا

''جب کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پھر بھی.....''

''ہاں'' وہ سوچتا ہے ''ایسا میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم میرے ساتھ ہو''

''کٹ''

کمرے میں خاموشی اور اندھیرے سے چونک کر ''مجھے پڑھنا ہے''

''آپ کو تو ہر وقت پڑھنا ہی ہوتا ہے'' بیوی نے جھنجھلاہٹ ظاہر کی۔

''تو کیا تم سے نمک، مرچ اور لکڑی کی بات کروں؟''

''تو کیا زندگی میں چیزوں کی ضرورت نہیں''

''ہاں ضرورت ہے۔'' (چند لمحہ خاموشی رہی)

''ضرورت تو ہر اس چیز کی ہے جس کی ضرورت محسوس کی جائے اور میں نے محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو ضرورت مجھے تمہاری بھی محسوس ہوتی ہے'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔

''یہ ضرورت تو مجبوری کے تحت تم محسوس کر رہے ہو، خلاف، مرضی'' پرند نے کہا۔

''خلاف مرضی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں خلاف مرضی'' پرند نے گردن ہلائی

''بکواس مت کرو! میں ایک مرد ہوں اور یہ عورت میری ضرورت ہے، میری فطرت ہے۔ میری اس سے تکمیل ہوئی ہے'' اس نے سخت لہجہ میں کہا

پرند نے چیں.....چیں.....چیں کرنا شروع کر دیا۔ پھر زور زور سے چیں .....چیں...چیں

اس نے دائیں ہاتھ سے پیشانی پکڑ لی'' للہ میرا مذاق نہ اڑاؤ''

''نہیں نہیں میں مذاق نہیں بنا رہا۔ پہلی چیز تو یہ کہ اپنی گفتگو میں لفظ عورت کے بجائے بیوی استعمال کرو اور جہاں تک ''ضرورت'' ''فطرت'' اور ''تکمیل'' کا سوال ہے تو

یہ الفاظ تمہارے رسمی اور زبانی ایجاب و قبول کے رشتہ کے تحت ادا ہو رہے ہیں ۔ ورنہ.....''

''یہ رسمی اور زبانی ایجاب وقبول سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''اس نے پوچھا۔

جسے آپ لوگ شادی بیاہ کہتے ہیں۔ جو الگ الگ قوموں میں الگ الگ طریقے سے رائج ہے وہی عورت جو آپ نکاح کر کے جائز کر لیتے ہیں، لگن منڈپ کے پھیرے لگانے کے بعد ناجائز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگنی کو شاکھشی مان کر عورت کو قبول کرنے والے کی نظر میں نکاح کے بعد عورت کو سویکار کرنا ناممکن ہے۔ جب کہ نکاح کرنے والا بھی انسان ہے اور منڈپ پر بیٹھنے والا بھی انسان ہے.....(ایک طویل وقفہ).....دیکھو مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ عورت کو مرد کی ضرورت ہے اور مرد کو عورت کی ۔ یہ ضرورت تو وہیں سے شروع ہو جاتی ہے جب دنیا میں انسان اتارا گیا۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ کیوں اتارا گیا کیسے اتارا گیا؟ انسان کی ہئیت میں اتارا گیا؟ یا اس کی ہئیت شروع شروع میں جانوروں سے مشابہت رکھتی تھی؟

''نہیں.....نہیں.....نہیں.....نہیں''

رکو ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے..... ہاں تو میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں وہ اصطلاح جسے ''سورگ'' کہتے ہیں جو خوبصورتی کی علامت ہے اس میں بھی آدم کو حوا کی ضرورت پیش آئی تھی اور جب یہ پوری کائنات ایک ہی آدم کی اولاد ہے تو اس کے لئے ایک ہی نظام کیوں نہیں.....؟'' پرند نے دلیل پیش کی

''تم غلط سوچ رہے ہو۔ دراصل الگ الگ آب وہوا میں رہنے والے انسانوں کی ضرورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے لئے الگ نظام اور الگ قانون کی ضرورت ہے''اس نے بھی دلیل دی

''مانا.....لیکن میرا اشارہ ان آفاقی ضرورتوں کی طرف ہے جو تمام انسانوں میں

یکساں ہیں.....یہ عجیب سا تضاد کلچر وتہذیب کا جب کہ اس لفظ کے معنی ہر قوم میں یکساں ہیں اور یہ معنی بھی انسان ہی نے دیئے ہیں۔آج انسان لفظ ومعنی کے جال میں اس طرح الجھ کررہ گیا ہے جس طرح مکڑی کے جال میں مکھی پھنس جاتی ہے۔ جتنا وہ نکلنے کی کوشش کرتی ہے اتنا ہی الجھتی جاتی ہے.....(ایک طویل وقفہ).....انسان دنیا میں پہلے آیا مذہب بعد میں۔اس لئے وہی اصول جو اس نے زندگی کے لئے مرتب کئے ہیں۔وہ انہیں کے پس منظر میں بولتا ہے۔ چلتا ہے اور یہ سب کے سب زندگی میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ ان کے خلاف وہ سوچ بھی نہیں سکتا جبکہ اس کو حق ہے سوچنے کا بلکہ ان کو اکھاڑ پھینکنے کا بھی حق حاصل ہے۔ اور اسی کے تحت وہ زندگی گزارتا ہے۔ اسی چیز نے انسان کو خلاف فطرت زندگی گزارنے کے لئے مجبور کررکھا ہے۔'' پرند نے طویل گفتگو کی اور خاموش ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا، خاموشی تھی، لیکن اس کے ذہن میں ایک بے ہنگم شور سا تھا۔وہ تکیہ کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے اور جلا کر کش لیتا ہے۔

''میں نے آپ سے کہا ہے زیادہ سگریٹ نقصان کرتی ہے''

''اور کم سگریٹ کوئی فائدہ کرتی ہے؟''

''سگریٹ سے کوئی فائدہ نہیں ہے، لوگ کہتے ہیں اس سے کینسر ہو جاتا ہے'' بیوی نے مشورہ دیا۔

''اور کینسر کا آدمی بچتا نہیں ہے''

''ہاں'' بیوی نے کہا

''اور جنہیں کینسر نہیں ہوتا ہے وہ بچ جاتے ہیں کیا؟''

''کیا لڑنا چاہتے ہو؟''

''بغیر لڑے بھی تو زندگی میں کوئی لطف نہیں'' اس نے ٹائم پیس کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے کہا رول گولڈ کے ہند سے اندھیرے میں چمک رہے تھے۔گھڑی سوا بارہ پر

زاویہ قائمہ بنا رہی تھی۔

''پاپا لڑنا بری بات ہے، کل جب ہماری ببلو سے لڑائی ہوئی تھی تو آپ نے ہم سے کہا تھا'' لحاف سے منہ نکالتے ہوئے پانچ سال کے بچے نے کہا۔

''ہاں بیٹے'' اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی ہی تلوار سے قتل ہو گیا ہو اور چاروں طرف تازہ تازہ لہو بکھر گیا ہو اور اس کے اندر اتنی بھی سکت نہ رہی تھی کہ وہ اپنے ہی بیٹے کو ڈانٹ کر یہ کہہ سکے بیٹے تم ابھی تک نہیں سوئے چونکہ جاگ تو وہ بھی رہا ہے۔ جب وہ اپنے بیٹے کے ہم عمر تا ھ۔

''جھوٹ بولنا پاپ ہے، جھوٹ بولنا پاپ ہے، جھوٹ بولنا پاپ ہے'' استاد نے سبق دیا۔ جب یہ سبق رٹ گیا تھا۔ عین اسی وقت کھٹ.....کھٹ ایک آواز

''جاؤ دیکھ کر آؤ کون ہے؟ اگر مجھے کوئی بلا رہا ہو تو کہہ دینا ہے نہیں'' استاد کا حکم

''ہے نہیں''

''کون کہہ رہا ہے'' ماسٹر صاحب کے دوست نے پوچھا۔

''ہمارے ماسٹر صاحب''

اور پھر ماسٹر صاحب کا زناٹے دار تھپڑ ''تم بہت بے وقوف ہو''

ہاں انہوں نے بالکل سچ ہی کہا تھا۔ واقعی میں بیوقوف ہوں۔ پرلے درجہ کا بیوقوف اور اگر اس وقت میں اپنے بیٹے کو ڈانٹ دوں تو یقیناً وہ اس وقت مجھے بیوقوف سمجھے گا لیکن جب میری برابر ہو جائے گا تو میری طرح اپنے آپ کو بیوقوف کہے گا؟.....یہ بچپن بھی بڑا عجیب وغریب زمانہ ہے شاید اس لئے کہ اس وقت کوئی پرندہ درمیان میں نہیں بولتا.....ل...ے....ک....ن....ے.....کن...لیکن یہ پرندہ ہے کون؟

یہ وہی پرندہ ہے جس نے شاید میرے ساتھ ہی جنم لیا تھا۔ مجھے اس کی تخلیق کا احساس اس روز ہوا جب میں عزرہ کے ساتھ ''آپا بونی'' کھیل رہا تھا۔ جھوٹ موٹ کے

چولھے پر ایک مٹی کی ہنڈیا رکھ دی گئی۔ میں آفس سے واپس آیا۔ منہ دھویا۔ عزرہ نے سامنے کھانا رکھا، پنکھے سے ہوا جھلنے لگی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ہم دونوں نے کھانا کھالیا۔ پھر عزرہ نے چارپائی پر لیٹ کر سونے کا بہانہ کیا۔ ذرا فاصلے پر عزرہ کے بابا پلنگ پر لیٹے تھے اور اس کی امی ان کے قریب چہرے پر جھکی ہوئی شاید کان میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ مجھے عزرہ کی بند آنکھیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کے گورے رخسار پر ایک بھلا سا تل تھا۔ میں نے سوچا اس تل کو اپنے ہونٹوں میں دبالوں..... جیسے ہی میں جھکا عزرہ کے باپ کا میرے سر پر ایک زوردار ہاتھ لگا۔ میری آنکھوں میں اندھرا کے ساتھ ساتھ آنسو بھی آگئے تھے۔ میں نے صرف یہ سنا تھا ''اب ایسی حرکت کرے گا؟''

''نہیں'' بغیر سوچے سمجھے جواب دیا۔ اس وقت میرا خیال تھا شاید میری غلطی یہ تھی کہ میں عزرہ کے چہرے پر جھکا تھا۔ اگر عزرہ اپنی امی کی طرح میرے اوپر جھکی ہوتی تو شاید آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔

اور اس پرند کی اڑان کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب میں نے عزرہ کو فطری حالت میں اچانک نہاتے دیکھا تو میرے جسم میں چیونٹیوں نے اپنے ڈنک گاڑ دیئے۔ پھر تو میں نے اس کے مکان اور اپنے مکان کا فاصلہ اس قدر تیز رفتاری سے طے کیا..... کہ گھر آتے آتے ہانپ گیا۔ لیکن اس پرند کی پیدائش سے پہلے کتنا اچھا لگتا تھا! جب کہ میں نماز پڑھ کر جاہ نماز اٹھاتا اور اس کے نیچے مجھے ریوڑی ملتی تھیں اور ماں کہتی تھیں ''بیٹے جو بچہ نماز پڑھتا ہے خدا اس کو ریوڑی دیتا ہے'' کس قدر اٹوٹ وشواش تھا مجھے اس بات پر۔ اور جب میں بڑا ہوا تو پتہ لگا ریوڑی ماں رکھتی تھی..... مجھے برا لگا۔ مگر ماں ..... خدا ..... خدا..... خدا ہے۔ ماں خالق ہے وہ میری.... نماز پڑھنے کے بعد ریوڑی دیا کرتی تھی مجھے۔ نہیں... نہیں قہار ہے ماں.....

''نہیں..... نہیں..... امی اب..... کاؤن آں..... نہیں کھاؤں۔ آں امی تائی

مجھے بچالو.....

''بول حرام زادے تیری کھال کھینچ لوں گی''

''ارے چھوڑ دے حاجرہ.....بس بھی کر.....'' تائی نے رحم کھایا۔

پھر ماں اس کمرے میں لے گئی جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ مٹی کا لپا ہوا فرش۔ اینٹوں کی دیواریں، جس پر سفیدی، سیاہی مائل ہو رہی تھی، چھت پر کہیں کہیں مکڑی کے جالے تھے کچھ اشیاء سلیقہ سے، کچھ بے سلیقہ پڑی تھیں۔ گرمیوں کی دوپہر تھی پسینہ کی تیز ابیت اور سورج کی تیزی سے بدن میں چلچلاہٹ ہو رہی تھی۔ کمرے میں مسلسل سسکیوں کی آوازیں...آں.....ایں.....آں ایں۔

''بیٹے بری بات ہے کسی کی بغیر اجازت تم کو گزک نہیں کھانا چاہئے۔ اگر تائی نے رنگ منگایا تھا تو تم نے گزک کیوں کھائی؟.....اب تو ایسی حرکت نہیں کرو گے'' ماں سمجھا رہی تھی۔

''ہاں.....ہاں.....ایں...ایں....لیکن ہم نے کل ایک آنہ گزک کے لئے مانگا تھا مگر آپ نے منع کر دیا تھا'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''کل بیٹے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے'' ماں نے اسے گلے لگا کر چوم لیا، اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور جس طرح وہ دنیا میں آئی تھی اسی طرح روتی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس درمیان میں وہ کبھی ہنسی تھی یا نہیں۔ لیکن ایک بات پر مجھے ابھی تک ہنسی آتی ہے جب کہ میں اپنے باپ کی بارات میں جا رہا تھا۔

''ہیں بھائی صاحب ابا کہاں جا رہے ہیں'' چھوٹی بہن نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''نئی امی کو لینے'' اس نے کہا۔

''کہاں سے؟''

''سبزی منڈی سے''

''اچھا میرے لئے ٹماٹر اور کھیرا بھی لانا'' بہن نے بڑی معصومیت سے کہا۔

خاندان کے تمام افراد قہقہہ مار کر ہنسنے لگے، اور وہ بے چاری حیرت سے ہمارا منہ دیکھ رہی تھی اور آج بھی اس بات کا ذکر چھیڑ جانے سے ہم لوگ ہنستے ہیں اور وہ ہمارا منہ تکتی ہے اور جب ہم نے نئی اماں کا منہ دیکھا۔ وہ لال کپڑوں میں ملبوس کتنی اچھی لگی تھی کتنا برا لگتا جب کہ تائی چچی کہا کرتی تھیں ''دوسری ماں ڈائن ہوتی ہے''

''اچھا'' جی چاہتا تھا ان کا منہ بکوٹ لوں۔

''تو ہر چیز دھونس سے کھایا کر، آخر تیرے باپ کا مال ہے'' دادا کا مشورہ تھا اور مشورہ تو نئی اماں کو لانے میں بھی شامل تھا۔ آخر پھر کیوں انہوں نے ڈائن کا انتخاب کیا ؟جب کہ ڈائن تو یہ پوری دنیا ہے۔ نئی امی کے آنے سے پہلے تائی کے، پھر چچی کے گھر رہے۔ سب نے رکھنے کی پوری پوری قیمت وصول کی۔ اور وہ عورت جو میرے باپ کی منکوحہ تھی پورے گھر پر سانپ کی طرح کنڈلی جما کر بیٹھ گئی ہے تو یہ تو اس کا حق ہے۔ پھر تمام خاندان کو اتنی تکلیف کیوں؟ اور پھر دوسری ماں۔ آخر وہ بھی کیا کرے؟ جب اس کے بچے ہوئے تو مجھ سے زیادہ پیارے ولاڈلے ہوئے اس لئے کہ وہ اس کی اپنی کوکھ کے تھے اور اگر میں بھی اس کی کوکھ سے جنم لیتا تو مجھے اس عورت کی یاد نہ آتی جس نے سب سے پہلے میرے باپ سے نکاح کیا تھا۔ پھر تو میں بہت پیارا ہوتا۔ اتنا ہی پیارا ہوتا جتنے .....اور آج اپنے تیرے کے چکر میں، میں پرایا ہو گیا ہوں.....بہت دور ہو گیا ہوں۔

''تم ایک استاد ہو، تمہیں کلاس میں اس شاگرد سے زیادہ پیار ہو گا جس نوعیت کا اس سے تعلق ہو گا'' پرند نے کہا۔

''لیکن یہ تو ناانصافی ہے۔'' اس نے کہا۔

ہا.....ہا....ہا.....انصاف، رشتے تعلقات، مذہب، سماج، قومیت، خون یہ

سب انصاف کے قاتل ہیں اور اتفاق سے انہیں تمام لفظوں سے انسان کی شخصیت بھی مکمل ہوتی ہے۔اب بھلا انصاف۔۔ہا.... ہا.... ہا۔'' پرندنے طنزیہ قہقہہ بلند کیا۔

''کٹ'' کمرے میں روشنی پھیل گئی۔اس کے قریب لیٹا ہوا بچہ سو گیا تھا۔ٹائم پیس جو کہ سامنے سنگاردان پر رکھی تھی رات ۱۲ بجکر ۲۵ منٹ پر رک کر زاویہ منفرجہ بنا رہی تھی اور اس کی کٹ کٹ کٹ کمرے کی خاموشی کو چاٹ رہی تھی۔

''فر۔....فر....ف..ڑ....''

''دیکھئے مجھے کتابوں سے نفرت ہے'' بیوی نے جھلا کر کہا۔

''کیوں؟''

''تمہارے اور میرے درمیان میں سرحد قائم کردی ہے''

''لیکن کتابیں مجھے بہت عزیز ہیں'' اس نے دائیں طرف دیوار پر بنی الماری پر رکھی کتابوں پر نظر دوڑائی اور ہاتھ میں رکھے رسالے کے ٹائٹل پر بنی عورت کی تصویر پر نظر ٹھہر گئی۔

''دیکھو جی جان ہے تو جہان ہے اور کتابیں بھی ہیں ورنہ ان کو دیمک پڑھتی ہے'' عورت نے مشورہ دیا۔

''ہا........ ہا........ ہا....قہقہہ تم بھی لگا سکتے ہو مگر نہیں لگا سکتے۔کیوں کہ زیادہ زور سے ہنسنا گناہ ہے کیوں؟ پرندنے کہا۔

روشنی پر پھیلائے تھی، مگر اس کے ذہن میں سمندر کے طوفانوں جیسا شور تھا، اور کمرے میں سمندر تہہ جیسی خاموشی تھی.....وہ سوچتا ہے'' اس بھری پری دنیا میں اتنا تنہا سا کیوں ہوں،......کیا ہر انسان تنہا ہے؟''

''نہیں ....نہیں.... ہر انسان اپنی، ایک الگ دنیا لئے گھومتا ہے۔وہ اس دنیا میں اس قدر مگن اور مصروف ہے کہ باہر سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔اور انسان دنیا کی بے

حسی کا شکوہ کرتا ہے جب کہ وہ خود بے حس ہو گیا ہے'' پرند نے کہا۔

''لیکن.....لیکن یہ بے حسی کیوں کر پیدا ہوئی؟'' اس نے سوال کیا

''یہ ہماری سوسائٹی کا المیہ ہے۔ کہ عدیم الفرصتی کے اس دور میں، اپنے عزیز کی میت کو بھی کاندھا دینے کے لئے انسان بار بار گھڑی پر نظر جمائے رہتا ہے۔ اب تم اپنے آپ کو دیکھو، صبح اٹھنا، اسکول جانا، ٹیوشن کرنا، رات کو واپس ہونا.....پھر سو جانا۔''

اس نے محسوس کیا جیسے کمرے میں بے حسی سی طاری ہو گئی ہے گو کہ چہار دیواری کے درمیان ڈھائی افراد رہتے ہیں.....اس کی نگاہیں چھت پر لگے کنڈے پر ٹنگ گئیں اس نے رسالہ مسہری پر بائیں طرف رکھ دیا۔ دائیں طرف بچھی چارپائی پر اس کی بیوی خاموشی سے پڑی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو''

''آپ کو''

''میں تو بھلا چنگا ہوں''

''دیکھئے آپ کو ذرا بھی فکر نہیں میرے سر میں اکثر درد رہتا ہے''

''ڈاکٹر کے چلی جاتیں''

''کیا سب کام میں ہی کروں، آپ کچھ نہیں کریں گے؟''

''صبح چلیں گے''

''صبح آپ اسکول جائیں گے۔''

''ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا۔ اچھا تم خود ہی چلی جانا''

''ہاں میرے لئے آپ کے پاس فرصت ہے کہاں.....فرصت تو آپ کو اس پہلی رات بھی نہ تھی جس رات تقریباً ہر انسان کو فرصت ہوتی ہے''

''اس وقت میں ٹیچرس یونین کا پروپگنڈہ سکریٹری تھا۔ اس رات میٹنگ ہونے

کے سبب ڈیڑھ بجے ختم ہوئی۔"

"میٹنگ کرنے، کمیش بٹھانے سے مسائل حل ہو گئے ہوتے تو ہندوستان مکرر سورگ ہو جاتا" پرند نے کہا۔

"آپ نے کیا دوسروں کا ٹھیکہ لے لیا ہے جو شخص اپنے مسائل حل نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے کیا حل کرے گا؟" بیوی نے طنز کیا۔

پرند نے زور زور سے قہقہہ بلند کیا..... اسے لگا پورا کمرا اس کی گونج میں ڈوب گیا ہے۔ ہاہا.... ہا.... ہا.... ہا اساتذہ کے مسائل جوں کے توں۔ لیکن رپورٹوں اور قراردادوں میں حل پراسرار طریقہ سے پوشیدہ ہے..... علاء الدین کے چراغ کی طرح جب ظاہر ہوگا تو گاندھی جی کے سپنوں کا بھارت سب کو دکھائی دے گا" پرند نے کہا۔

"جدوجہد ترقی کا راز ہے جو ہم کر رہے ہیں" اس نے کہا۔

"جیسے گوتم سنسار کی مصیبتوں کا انت کرنے کیلئے جنگل کو نکل گئے۔ تپسیا کی، گیان دھیان میں لگ گئے، بھوک پیاس، کٹھن پرشرم بھوگتے رہے..... لیکن نہ تو وہ موت کا انت کر پائے اور نہ مصیبتوں کا علاج ..... بلکہ خود موت اور مصیبتوں کی بھینٹ چڑھ گئے..... اصل میں موت خود ایک انت ہے" پرند نے وکالت کی۔

"جدوجہد، صرف مٹنگ یا اجلاس بٹھانے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے عمل بھی ضروری ہے" بیوی نے گفتگو کا کنارہ پکڑا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں وہی چاہتی ہوں جو ہر عورت اپنے مرد سے چاہتی ہے"

"تم کونسی عورت کی بات کر رہی ہو، کیا اپنی جیسی.....؟" اس نے کہا۔

"کیا چیز میرے اندر نہیں جو ہر عورت میں ہوتی ہے؟" بیوی نے کہا۔

وہ سوچتا ہے بے شک تم جسمانی اعتبار سے مکمل ہو۔ اور کہتا ہے "میں نے

تمہارے حقوق پورے کئے ہیں۔کیا کمی رہی ہے میرے حقوق میں''

کمرے میں روشنی ہے، خاموشی ہے، سردی ہے اور تمام چیزیں معمول کے مطابق ہیں گھڑی کی ٹک ٹک اور جھینگروں کی جھیں جھیں خاموشی کو چاٹ رہی ہے۔ بڑی سوئی چھ پر چھوٹی سوئی بارہ پر زاویہ مستقیم بنا رہی ہے۔

''حقوق ؟ہاں (ایک گہرا سانس)روٹی دیتے ہو، تنخواہ دیتے ہو، بچے دیتے ہو'' بیوی نے گفتگو جاری کی۔

''تمہیں مانگنا چاہتی ہے'' پرند نے آہستہ سے کان میں کہا۔

''تم بیچ میں کہاں سے بول پڑتے ہو'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔اس کی آواز ٹک ٹک، جھیں جھیں پر حاوی ہو کر قبائے خاموشی تار تار کر گئی۔

''ہاں میں صحیح کہہ رہی ہوں'' بیوی کی آواز نے کمرے کی خاموشی پر لپٹنے کی کوشش کی۔

''یہ احسان بھی کیا کم ہے، کہ تم میرے گھر بارات لائے اور میں تمہارے ساتھ چلی آئی ؟'' بیوی نے گفتگو کا سلسلہ پکڑا۔

''بارات لانا، تمہارا میرے ساتھ چلے آنا۔ یہ سب احسان کے دائرے میں نہیں آتا.....دراصل میری اور تمہاری تکمیل مشیت ایزدی تھی'' اس نے اپنی بیوی کو قائل کرنا چاہا۔

''کیا تم اس سے آگاہ تھے؟'' بیوی نے بات کا کنارہ پکڑا۔

''اگر آگاہ ہوتا۔تو جو، اب ہے، وہ نہیں ہوتا'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ سوچتا ہے.....لیکن یہی سچ ہے...یہی مشیت ایزدی ہے۔ یہی تقدیر ہے...لیکن تقدیر؟ کاتبِ تقدیر نے، وہ کاغذ تو لکیروں سے پہلے ہی بھر دیا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا اب حالات جو آرہے ہیں وہ انہیں لکیروں کے مطابق آرہے ہیں تو پھر منّتوں یا تدابیر پر یقین کیوں رکھتے ہو؟'' پرند نے بات منقطع کی۔

''ہاں.... منتوں سے کیا ہوگا؟'' اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

''کل ہی تو آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلایا ہے منت بولی تھی'' بیوی نے بات پکڑی۔

''چار فقیروں کو کھانا کھلانے کا ٹرانسفر سے کیا تعلق ہے؟'' پرند نے طنز کیا۔

''یہ اپنے اپنے یقین اور اعتقاد کا معاملہ ہے'' اس نے کہا۔

''یقین؟ افسوس ہے ایسے اعتقاد پر۔ جیسے کہ تقدیر کا کاغذ تمہارے سامنے تحریر کیا گیا ہو اور اس میں لکھا ہو چار فقیروں کو کھانا کھلانے سے ٹرانسفر ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارا ٹرانسفر ہونا ہی تھا چاہے تم منت رکھتے یا نہیں رکھتے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اس قدر بزدلے ہو کہ جب بھی مخالف حالات سے غیر محفوظ سمجھتے ہو تو جاہ اماں کے طور پر تقدیر، مشیت، منت کی رٹ لگانے لگتے ہو جیسے طوطا ٹیں ...ٹیں.....ٹیں کرتا ہے'' پرند نے بات ختم کرتے ہوئے گردن ہلائی۔

''تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟''

''سچ کہا'' بیوی نے تائید کی۔

اچانک کمرے کے باہر کھڑ....ڑ.....ڑ.....ڑ کھڑ کی آواز ہوئی اور ہو چونک کر دروازہ کو دیکھنے لگا۔

''بلّی ہوگی''

''ہا..... ہاں...ہوں''

''آپ ڈر کیوں رہے ہیں؟ اب تو کمرے میں روشنی ہے'' بیوی نے کہا۔

''ہاں'' اس نے کہا۔ وہ سوچنے لگا ''ہاں اگر زندگی میں روشنی نہ ہو یا روشنی کی تمنا نہ ہو تو پھر باقی کیا رہ گیا؟ سوائے اندھیرے کے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کل تک عورت کے بارے میں جو آئیڈیل میرے ذہن میں تھا وہ آج بھی برقرار ہے گو کہ میری شادی ہو گئی ہے

اوراب دوسری عورت کا تصور بھی پاپ ہے!ایک گناہ۔آخرایسا کیوں؟اس نے سگریٹ کا آخری کش لیااور کمرے کی روشنی نے دھوئیں کی چادراوڑھ لی۔وہ پھرسوچتاہے''زندگی کے اندھیرے اوراجالے کے درمیان کچھ فرق ہےتو صرف''اگر'' کا۔اگر میں پرائم منسٹر کے یہاں جنم لیتا تو میں.....اور پھرزندگی کے بارے میں یہ خیال نہیں رکھتا جواب ہے لگتا ہے لفظ''اگر'' کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے؟جب بھی کوئی کام انسان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہےتو بھی اگر کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہےاور کام اس کے موافق ہوتا ہےتو بھی لفظ''اگر'' سے اپنی بات واضح کر کے اطمنان حاصل کرتا ہےخودمیری زندگی کے رخ کولفظ''اگر'' نے موڑ دیااگروہ رات نہ آئی ہوتی...لیکن کیوں نہ آتی؟

''تمہارارشتہ طے کردیاہے۔تمہیں رشتہ پسند ہے''باپ نے پوچھا۔

کمرے میں مدھم روشنی تھی،کم روشنی....زیادہ اندھیرا.....رشتہ.....خاموشی مشورہ.....خاموشی اورایک طویل خاموشی کمرے میں طاری تھی۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں''باپ نے خوشی کا اظہار کیا۔

''نہیں''

''اب تم سوجاؤ۔رات ہورہی ہے''باپ کا مشفقانہ حکم۔

اور واقعی رات ہوگئی .....اندھیرا پھیل گیا چاروں طرف اور وہ کرن جو اکثر دکھائی دیتی تھی اب جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے ماند پڑتی جارہی ہے .....رات کی سیاہی بہت گہری ہوگئی ہے۔

''اس لئے کہ اب وہ کرن حاصل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے''پرند نے سلسلہ منقطع کیا۔

وہ سوچتاہے رشتہ میرا ہوا.....میری بیوی کومحرم سے نامحرم تک سب نے دیکھا ۔پھرکوئی باپ اپنے بیٹے کا برا تھوڑئی سوچتاہے۔پھرآخران کواپنے فرض سے سبکدوش ہونا

تھا۔ آخر مذہبی فرائض بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے'' سوچنے کا ایک طویل سلسلہ۔

''اگر تمہارا باپ شادی نہ کرتے تو تم کنوارے رہ جاتے۔ تمہارے باپ کا دامن گندہ ہو جاتا۔ اور مرنے کے بعد وہی دامن تم حشر کے میدان میں پکڑ لیتے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے سے پہلے تمہاری بیوی نے تمہارا دامن پکڑ لیا۔ چوں کہ جوڑا آسمان سے اترتا ہے اور اس طرح تینوں کی عاقبت سدھر گئی.....'' پرند نے کہا۔

''ہاں یہی سچ ہے، آسمانی فیصلہ؟ باپ کی مرضی، تمہاری مرضی حکم ربّی سب سچ ہے'' وہ زور سے چلایا.... کمرے میں آواز گونج گئی.....اس نے گھڑی پر نظر اٹھائی دونوں سوئیاں ۱۲ اور ۶ کے اعداد پر ہاتھ پھیلا کر زاویہ مستقیم بنا رہی تھیں۔

''کیا.....آپ ڈر گئے، باہر شاید بلّی ہے'' بیوی نے کہا۔

''نہیں.....نہیں..... ہاں..... ہاں بلّی ہے''

کمرے کی دیواریں کفن پوش مردوں کی طرح صف باندھے خاموش کھڑی تھیں ، الماری پر کتابیں خاموشی سے رکھی تھیں ، اندھیرا خاموش تھا۔ مسہری خاموش.....سب خاموش.....موش.....ش.....ش۔

''آپ کی خاموشی سمندر سے مشابہ ہے''

''کیوں؟'' وہ سوچتا ہے کبھی سطح سے تہہ تک کا فاصلہ طے کرو۔

اس نے تکیہ کے نیچے سے پیکٹ نکالا اور سگریٹ ہونٹوں کے دائرہ میں لگا لیا۔ ماچس ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔

''یہ رہی''

اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی مدد سے تیلی پکڑی اتفاقیہ طور سے اسی انداز میں جس طرح سمن پکڑتی تھی۔

''مجھے آپ کا سگریٹ جلانا اچھا لگتا ہے، لیکن آپ کا سگریٹ پینا پسند نہیں''

ماچس پر تیلی گھستی تھی۔ اچانک تیلی پر شعلہ نمودار ہو گیا۔ وہ چونک گیا اور تیلی کی سرخ لو کے درمیان پیلے رنگ کو بغور دیکھنے لگا۔

چارپائی پر بیٹھی بیوی اسے گھور رہی تھی یکا یک جب اس کی نظر ٹکرا گئی وہ جھینپ سا گیا اور سگریٹ کو جلانے میں مصروف ہو گیا۔ چہار اطراف سگریٹ کا دھواں کمرے کی خاموشی پر پھیل گیا، سگریٹ کا شعلہ ایش کی پرت کے نیچے، خاکستر میں دبی چنگاری کی طرح چمک رہا ہے اسے محسوس ہوا جیسے وہ چمک انسانی جسم میں تبدیل ہو گئی ہو۔ کتنی اچھی تھی وہ جیسے صبح کی پہلی کرن، چھوٹا سا قد، باریک ناک ونقشہ، نازک سا بدن، انداز گفتگو الفاظ کو چن چن کر ادا کرنا جیسے پھولوں کو چن رہی ہو۔ ہم نے ہونٹوں تک کے فاصلے طے کر لئے تھے۔ چونکہ ہم کلچرڈ تھے اس لئے جسموں کے حصار میں قید رہے گو کہ جی چاہتا تھا اس قید کو تر ڑ دیں لیکن نہیں توڑ سکے اور ہم انتظار کرنے لگے حالات کے فیصلے کا۔ پھر اس کہانی کا بھی وہی روائتی انجام ہوا۔ جس کا سلسلہ آدم کی کہانی سے جا کر ملتا ہے.....اور اب ہم اس قدر غیور ہو گئے ہیں کہ ایک دوسرے کو چاہتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے ان راستوں کو ترک کر دیا ہے جو اس کے گھر تک جاتا ہے.....یہ کیا فیصلہ ہے؟ کس کا فیصلہ ہے؟ ہر بار یہی کہانی دہرائی جاتی ہے، ہر کہانی کا یہی انجام ہوتا ہے ہر انسان کے ساتھ یہی المیہ ہے اور اتفاق سے ہر انسان کا فیصلہ بھی وہی روائتی فیصلہ ہے۔ آخر کیوں؟.....کیوں؟

''آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' بیوی نے پوچھا۔

''سب جانتے ہیں کہانی وہیں ختم ہوتی ہے جہاں سے اس کا نقطۂ عروج ہوتا ہے.....لیکن.....لیکن چونکہ تم شتر مرغ ہو اس لئے حالات کے ہاتھوں سونپ کر دیکھے ہوئے راستہ پر اندھی منزل کے مسافر کی طرح چلنا شروع کر دیا'' پرند نے سلسلہ گفتگو کاٹتے ہوئے کہا۔

رات اور روشنی دھندلی دکھائی دے رہی ہے کمرے کی ہر چیز بھیگی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

''کیا ہوا؟'' بیوی نے ٹوکا۔

''دھواں لگ گیا'' اس نے جواب دیا۔

''سگریٹ پھینک دیجئے''

''کیوں''

''ورنہ جل جاؤ گے'' پرند نے کہا

''جلنا زندگی کی علامت ہے سگریٹ کی طرح'' اس نے جواب دیا۔

''ان آبلوں سے ڈرو جو پھوٹ کر زخم بنتے ہیں اور پھر ناسور'' پرند نے کہا۔

''وقت دنیا کا سب سے بڑا مرہم ہے'' اس نے کہا۔

''وقت مرہم ہی نہیں ایک زخم بھی ہے'' پرند نے کہا۔

''ہاں یہ سچ ہے'' اس نے سگریٹ کا کش لیا۔

''دراصل جب تم۔ مرہم کا نام لیتے ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے سینہ پر ایک بھاری سی سل رکھی ہو''

''آپ خاموش کیوں ہیں'' بیوی نے کہا۔

''ابھی تو اس میں شعلہ باقی ہے جب اپنے آپ بجھے گی تب پھینکوں گا''

''سگریٹ سے بچوں کی طرح ضد کر رہے ہو'' بیوی نے کہا۔

اس کو ہنسی آ گئی ..... کمرے میں آوازوں کے سائے رینگ گئے ۔ وہ سوچتا ہے The child is the father of man انسان کی عمر کا یہ سفر جو بچپن سے شروع ہو کر بچپن ہی پر ختم ہوتا ہے'' اس نے کہا۔

''تمہاری تو یہ باتیں میری تو سمجھ میں نہیں آتی'' بیوی نے کہا۔

''سمجھانے بیٹھا تو بوڑھا ہو جاؤں گا'' اس نے کہا۔

''اگر بوڑھے ہو گئے تو اپنے باپ کی طرح باتیں کرنے لگو گے'' پرند نے کہا۔

کمرے میں ٹائم پیس کی آواز ٹک ٹک .....ٹک .....ٹک جھینگروں کی جھیں .....جھیں.....جھیں، اور روشنی اور اندھیروں کے سائے تھے۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟'' اس نے گفتگو جاری کی۔

''سوچ رہی ہوں..... غلطی ہمارے بزرگ کرتے ہیں اور خمیازہ ان کی پوری نسل اٹھاتی ہے''

''ہاں تم صحیح کہہ رہی ہوں۔ ہر انسان گناہوں کی صلیب اپنے کاندھے پر لئے گھوم رہا ہے'' اس نے کہا۔

وہ سوچتا ہے ''گناہ ارتقائے انسانی کا فطری عنصر ہے۔ پھر انسان، انسان کو کوئی حکم صادر کرتے ہوئے اس کی فطرت کو کیوں نظر انداز کرتا ہے؟

''ذرا غور کرو اس کائنات کی تخلیق بھی ارتکاب جرم کا سبب ہے جس میں مشیت ایزدی بھی شامل تھی اور پھر یہ گناہ و سزا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے'' پرند نے تائید کی۔

''لیجئے میں کہنا چاہتی ہوں آپ آدم کو لے بیٹھے؟'' بیوی نے کہا۔

''اچھا بولو'' اس نے کہا۔

''جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے تو ہمارا بیٹا بڑا ہو جائے گا تم اس سے کہو گے کما کر لاؤ، اس کا رشتہ کرو گے پھر اس سے پوچھو گے تمہیں پسند ہے یا نہیں۔ اور اگر اس نے کہہ دیا ''نہیں'' تم کہو گے ناخلف ہے اور اگر ''ہاں'' کر دی تو تم اپنی بوڑھی گردن ہلاتے ہوئے کہو گے'' آخر میرا بیٹا ہے مجھ سے خلاف تھوڑی جا سکتا ہے'' بیوی نے روایت دہرائی۔

''نہیں.....نہیں.....میں اپنے بیٹے کو پوری آزادی دوں گا'' اس نے کہا

''جیسے تمہارے باپ نے تمہیں دی تھی'' بیوی نے کہا۔

''اگر میں اپنی آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تو تم میرے گھر نہیں آتیں''

''لیکن میں تو تمہارا دامن پکڑے بیٹھی تھی''

''اگر کوئی ضدی عورت میرے بیٹے کا دامن پکڑے بیٹھی ہو تو غلطی میرے سر جائے گی یا میرے بیٹے کے؟''

پرند نے قہقہہ بلند کیا..... ہا..... ہا..... ہاہاہا۔

''نہیں، وہ غلطی نہ تمہارے سر جائے گی اور نہ تمہارے بیٹے کے، غلطی ہمیشہ عورت کے سر جاتی ہے'' بیوی نے کہا۔

وہ خاموش ہو گیا، کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

''جس طرح ہر غلطی کی ذمہ دار میں ٹھہرائی گئی ہوں۔ دراصل عورت، مردوں کے ہاتھوں کا ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اور نہ صرف مرد بلکہ عورت کے ساتھ عوت بھی ظلم کرنے میں نہیں چوکتی۔

''اس میں شوہر کا کیا قصور؟'' اس نے کہا۔

شوہر کی خدمت کرے تو کہا جاتا ہے۔ بیٹے کو والدین سے جدا کرنا چاہتی ہے، یا یہ کہ ہر وقت میاں کے پاس گھسی رہتی ہے۔ سارا دن کام کاج کرنے کے باوجود کسی کو آنکھ تلے نہیں آتا۔ صبح جلدی اٹھو، رات کو دیر سے سوؤ۔ پھر بھی مرد کے لئے جاگو۔ ہر فرد کی جائز ناجائز بات برداشت کرو.... اگر میکے والوں کی بھی برائی ہو رہی ہو تو بھی برداشت کرو۔ عجیب مصیبت ہے اب دیکھو نا تمہارے باپ کو یہ شکایت ہے کہ ہم لوگ ان کی مدد نہیں کرتے۔ کل تین سو روپیہ میں گزارا کرنا ہوتا ہے۔ چالیس روپیہ مکان کا کرایہ، دودھ، گیہوں، ایندھن اور روزانہ کے اخراجات..... ننگی کیا اوڑھے کیا سکھائے.....''

''آدمی ٹنگیں کاٹے یا چادر تان کر لمبائی بڑھائے۔ جو نا ممکن ہے'' پرند نے بات کاٹی۔

''بہن بیٹیوں کا آنا جانا، لین دین بھی تو ضروری ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ نہ کیا

جائے تو دنیا والے کیا کہیں گے، باوجود اس کے، تمہارے باپ کی یہ شکایت کہ میں نے ان کے بیٹے کو چھین لیا ہے'' بیوی کی طویل گفتگو۔

''ہاں، یہ سب صحیح ہے، لیکن ان کا یہ سوچنا بھی غلط نہیں کہ آخر میں ان کا بیٹا ہوں ۔انہوں نے میری پرورش بھی اسی انداز اور اسی چاہت سے کی ہوگی، جس طرح ہم اپنے بیٹے کی کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے حقوق پورے نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ آخر ان کے سامنے بھی تو پورا پورا خرچ ہے جس کو وہ اپنے بوڑھے کاندھے پر اٹھائے گھوم رہے ہیں اور میں جوان ہو کر بھی ان کا بوجھ ہلکا نہیں کر پایا۔ کبھی کبھی تو مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ مگر چونکہ زندگی گزانی ہے۔ اس لئے بے شرم ہو کر زندگی گزار رہا ہوں'' اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''یہ سب ٹھیک ہے، میں نے کیا آپ کو روکا ہے کہ آپ ان کی مدد نہ کریں۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ میں نے بیٹے کو باپ سے جدا کر دیا.....

''اچھا اب خاموش ہو جاؤ'' اس نے بات کاٹی

''کیوں'' بیوی نے پوچھا۔

''میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے، بڑے بوڑھوں کی بات کا برا نہیں ماننا چاہئے، برداشت میں جو مزہ ہے وہ کسی میں نہیں'' اس نے کہا

''کب تک برداشت کیا جائے، ایک حد ہوتی ہے'' بیوی نے کہا

''اگر برداشت نہیں کروگی تو گھر میں فساد ہوگا۔ جو مجھے پسند نہیں اور یہ تمہارا فرض ہے کہ تم میری پسند، ناپسند کا خیال رکھو.....''

''اس لئے کہ تم ایک مرد ہو اور پھر تمہارا مرتبہ اس لئے بھی بلند ہے کہ تم ایک شوہر ہو'' پرند نے قطع کلام می کرتے ہوئے طنز کیا۔

.....جس طرح میں تمہاری پسند ناپسند کا خیال رکھتا ہوں'' اس نے اپنی بات پوری کی

''کیا خیال رکھتے ہیں؟ مجھے یہ ناپسند ہے کہ تمہارے ماں باپ، بہن بھائیوں کی ناجائز بات سنوں'' بیوی نے کہا۔

''تم نے ان باتوں کو گنا دیا.....ذرا سوچو میں علیحدہ صرف اس لئے ہوا کہ تمہارے اوپر کوئی ظلم نہ ہو....

''غلط اس لئے ہوئے کہ تمہارا ذہنی سکون برقرار رہے'' پرند درمیان میں بولا۔

''.....رہی ماں باپ کی بات، سوچ لو جیسے تمہارے ماں باپ ویسے یہ ہیں.....''

''اسی انداز میں تمہارے ماں باپ کو بھی سوچنا چاہیے کہ یہ ان کی بیٹی ہے'' پرند پھر بولا۔

''اور تمہارے چھوٹے بہن بھائی جو چاہے کہہ جاتے ہیں .....پھر ان کی حمایت یہ کہہ کر کیوں کی جاتی ہے کہ دیور نندوں کا رشتہ بڑا ہوتا ہے؟ وہ جو چاہیں کہیں، سننا پڑے گا'' بیوی نے کہا۔

''اچھا چپ ہو جاؤ۔ فضول کی باتوں میں رات نہ گنواؤ.....''

کمرے میں پھر خاموشی، دیواروں پر روشنی اور اندھیرے کے سائے میں لپٹی ہوئی خاموشی۔

''میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ تم عورت ہو اور تمہاری تخلیق ٹیڑھی پسلی سے ہوئی ہے'' اس نے کہا۔

''تمہیں پھر بھی یہ شکایت ہے کہ میں اپنا عورت پن کیوں نہیں بھولتی؟''

''تم کو اس کے عورت ہونے پر شکایت ہے۔ جب کہ تم اپنا مرد پن جتا رہے ہو ...پھر.....پھر یہ کیوں بھول رہے ہو وہ ٹیڑھی پسلی تمہاری ہے۔ اسی لئے وہ تمہارے جسم کا ناقابل تقسیم جز ہے۔'' پرند نے کہا۔

''پھر تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ کوئی کسی کا باپ نہیں، کوئی کسی کا بیٹا نہیں

.....پیسہ باپ ہوتا ہے اور پیسہ ہی بیٹا'' بیوی نے جیسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''اور وہی میری دی ہوئی تلوار تم میری گردن پر رکھ رہی ہو۔''

وہ سوچتا ہے۔ ہاں میری بیوی سچ کہتی ہے۔ میں سروس کے لئے بہت پریشان تھا، گھر میں کوئی عزت نہیں تھی، فیملی کا زائد فرد تھا۔ بہن بھائی، سوتیلی ماں اور باپ کے درمیان بالکل اکیلا تھا.....جی چاہتا تھا خودکشی کرلوں.....

''جرأت مندانہ عمل ہوتے ہوئے بھی حرام ہے'' پرند نے کہا۔

.....اور جب معمولی سروس ملی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے...خوشیوں کے آنسو ،قیمتی آنسو، اس وقت میرے ان آنسوؤں کو رضیہ نے اپنی مٹھی سمیٹ لیا تھا.....اور جب اس کی شادی ہوئی تو اس نے آخری خط میں لکھا کہ تمہاری یاد میری قبر میں شمع کی طرح روشن رہے گی اور میدان حشر میں نفسی نفسی کا عالم ہوگا تو میری نگاہیں تمہیں تلاش کریں گی اور اگر تم نے اس وقت بھی میرے ساتھ بے رخی برتی پھر بھی میں شکایت نہیں کروں گی۔ بلکہ اس وقت بھی اپنی قسمت کو مورد الزام ٹھہراؤں گی کیا سمجھے ہاں؟'' وہ سوچتا ہے اس وقت رضیہ کیسی ہوگی؟ کیا اس کو میری یاد آتی ہوگی۔ ضرور آتی ہوگی میں بھی تو اس کو یاد کر رہا ہوں .....نہیں.....نہیں سب جھوٹ ہے.....کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا.....

پرند نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا'' کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا لوگ مرنے والوں کو بھی بھول جاتے ہیں.....ایک جان ہزاروں غم.....کس کس کو یاد رکھے.....کیا وہ پاگل نہیں ہو جائے گا.....اور پھر یاد رکھنے یا بھولنے سے اس کائنات میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا.....کوئی پیدا ہو جائے یا مر جائے کائنات کا نظام جس طرح چل رہا ہے، چلے گا.....''

''نہیں.....نہیں.....انسان اس قدر سنگ دل نہیں ہوسکتا'' اس نے کہا۔

''کسی اپنے عزیز کی موت کے بعد بھی، وہ کھانا کھاتا ہے، پانی پیتا ہے، زندگی

کے تمام حقوق پورے کرتا ہے. یہ سنگ دلی نہیں ہے بلکہ تقاضۂ فطرت ہے، مجبوری ہے.....(مختصر وقفہ) رضیہ جو قبر میں بھی تمہارے ساتھ چلنے کو راضی تھی .....اب وہ اپنے شوہر اور بچوں میں اس قدر مشغول ہے کہ اسے ذرہ برابر بھی خیال نہیں آتا۔ اور یہ اس کا قصور نہیں۔'' پرند نے کہا۔

''یہ فطرت انسانی، جانور کی خصلت سے ملتی ہے''

''جسے تم جانور کی خصلت کہتے ہو.....وہ ہی زندگی کی حقیقت ہے.....اور انسانی تہذیب کی نشانی بھی.....'' پرند نے فلسفیانہ دلیل دی۔

''پھر مجھے ام شب رضیہ کیوں یاد آرہی ہے؟'' اس نے کہا۔

''اس وقت تمہیں رضیہ کی معصومیت پر ہنسی آئی تھی....اور اس رات تمہیں رضیہ کی یاد ستا رہی ہے۔ شاید اس لئے جب تم اسکے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نکہت سامنے کرسی پر دوزانو بیٹھی تھی۔ کمرے میں اتھاہ خاموشی تھی، دیواروں پر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ درمیان میں ایک میز تھی اور اس پر کتابیں رکھی تھیں.....تم نے نکہت کو مشت میں قید کرنا چاہا لیکن باد صبا کا جھونکا اسے اڑا کر لے گیا.... یکا یک دروازہ کی کنڈی کی آواز ہوئی وہ چونک گئی....نہیں.....نہیں. کہہ کر نکہت پیچھے ہٹ گئی.....اور پھر وہ اپنے ہی خول میں قید ہوگئی.....میز درمیان میں رکھی تھی اس پر کتابوں کا بوجھ تھا.....رضیہ کی معصومیت تم نے نکہت کے انداز تلاش کرنی چاہی.....اور نکہت تمہیں کتابوں میں تلاش کرتی رہی.....حقیقت ''زندگی'' میں ملتی ہے۔ کتابوں میں نہیں.....'' پرند نے یاد دلایا۔

میں نے کمرے میں نظر دوڑائی تھی، درمیان میں میز تھی، چھت پر پنکھا گھوم رہا تھا۔ اس کی سائیں سائیں کمرے کی خاموشی کو چاٹ رہی تھی۔ دائیں جانب رکھی ایک میز پر گل دان میں پھول مرجھا رہے تھے .....میں چاہتا تھا سمن کو پھر سے خوشبو اور تازگی مل جائے....میں یہ بھی چاہتا تھا کہ جو رنگ پھیکا ہو گیا ہے.....وہ مکرر گہرا ہو جائے۔

''نکہت تم اس انداز میں سوچو، جس انداز میں، میں سوچ رہا ہوں''میں نے کہا تھا۔ کمرے میں خاموشی جوں کی توں تھی، پنکھے کی سائیں سائیں چاروں طرف رینگ رہی تھی۔ پھر ہوا کا جھونکا آیا کھڑکی کے پٹ کھل گئے۔ میں سوچنے لگا اس خاموشی کا کیا مطلب ہے؟ مجھے ایک پرانا تجربہ ہے کہ میری خاموشی کو دوسروں نے اقرار تسلیم کیا ہے جب کہ مجھے انکار تھا۔

''کبھی کبھی بے تکلفی کس قدر معقول لگتی ہے تم سے یاسمین نے کہا تھا''میرے خون کا ایک ایک قطرہ، جسم کا ایک ایک رونگٹا آپ کا ہے اور تم اس لئے مسکرا گئے کیونکہ شریف ہونے کا فخر تھا تم کو۔'' پرند نے اس وقت مجھے قائل کیا تھا اور اس ڈرائنگ روم میں پرند کے ساتھ میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے پرند پر پیار آیا مگر مجبوری یہی تھی کہ دام گرفتاری کے باوجود اس کی آزادی کو مصلوب کرنا ناممکن تھا پرند تو پھر پرند ہے۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں نکہت تھی۔ درمیان کی میز پر کتابوں کا بوجھ، ہمارے انٹلیکچول ہونے کی پہچان، ہمارے موضوع بحث ٹیگور، غالب، منٹو، کامو، وغیرہ تھے، ان شخصیتوں کے بارے میں عالمانہ گفتگو کر کے یا تو ہم دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے یا اپنے آپ کو، ممکن ہے اپنے اپنے وجود کو بھولنے کے لئے انسان دوسروں کی شخصیتوں پر غور کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کو بھولنے کے لئے انسان دوسروں کی شخصیتوں پر غور کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس ڈرائنگ روم میں بالکل تنہا تھا۔ بے چین سا۔ اور اسی کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ اچانک اسی لمحہ مجھے یاد آیا تھا۔ جس دن میں سمن سے آخری بار ملا، پھر اس کے بعد اس سے ملاقات نہ کر سکا۔ وہ کرسی کتنی اچھی تھی، جس پر بیٹھ کر میں ہمیشہ اس کے ہونٹوں کو چومتا تھا اور اس کی خوبصورت، ملائم اور سیاہ زلفیں اپنے ہاتھ میں لپیٹ کر آنکھوں سے لگا لیا کرتا تھا لیکن رازداری کا یہ جذبہ ظاہر ہوا، ذلت اور ناکامی کا سبب بن گیا۔ کیا کوئی انسان اس جذبہ سے مبرا ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر انسان اس یاس کو

اپنے ساتھ کیوں لئے پھرتا ہے؟ اور یہی نکہت جو بیٹھی ہے ایک دن اسی ڈرائنگ مین اسی طرح بیٹھی تھی۔ میں نے سگریٹ جلائی تھی۔

''مجھے سگریٹ کی خوشبو اچھی لگتی ہے'' نکہت نے کہا تھا۔

میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا سمن کو سگریٹ جلانا پسند تھا اور نکہت کو سگریت کی خوشبو.....کیسا عجیب اتفاق ہے۔ کاش نکہت میں تمہارے ہونٹوں کی حدت اپنی انگلیوں کے لمس سے محسوس کرسکتا.....لیکن کبھی کبھی سوچتا کہ کہیں یہ سمن کیساتھ بے وفائی تو نہیں۔

''محبت کے بارے میں وہ روائیتی تصورات جب کہ ہواؤں میں محل تعمیر کئے جاتے تھے اب تقریبا چکنا چور ہو چکے ہیں اور تم اب تک ماضی سے بھوت بن کر چمٹے ہوئے ہو'' پرند نے کہا۔

''ہاں میں بھول نہیں پاتا'' اس نے کہا۔

''تمہاری یہ روایت پرستی تمہارے وجود کے لئے ایک خطرہ ہے'' پرند نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''میں روایت پسند نہیں.....لیکن بھول نہیں پاتا.....ایک چیز یاد ہوتی ہے'' اس نے کہا۔

''Reasoning کی بنیاد پر انسان کو حیوان پر فوقیت حاصل ہے'' پرند نے کہا۔

''لیکن Sense of beauty بھی انسان کی ایک پہچان ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا''

''مجھے اس سے کوئی انکار نہیں لیکن جو انسان جذبات کا سراسر غلام ہو وہ Normal نہیں ہوسکتا'' پرند نے کہا۔

''لیکن کیا انسان کی تکمیل بغیر جذبات کے مکمل سمجھی جائے گی۔ کون سا انسان ہے

جواپنی ماں کی موت پر آنسو نہ بہاتا ہو، خوبصورت عورت کو دیکھ کر جذبات متحرک نہ ہوتے ہوں۔ قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔'' اس نے کہا۔

''دراصل ہم اپنے عزیز و اقارب کی موت پر روتے چلے آئے ہیں، اس لئے روتے ہیں۔ اگر ہمارے بزرگوں نے خوشیاں منائی ہوتیں، تو ہماری آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں ہوتے۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر جذبات تب ہی متحرک ہوتے ہیں جب کہ انسان کے پیٹ میں روٹی ہوتی ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ خوبصورت مناظر سے ہر آدمی لطف اندوز ہوسکتا ہے'' پرند نے دلیل پیش کی۔

''محبت کا روٹی سے کوئی رشتہ نہیں .....جمالیاتی حس سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے'' اس نے کہا۔

مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے۔ دراصل محبت کا عمل، غیر شعوری طور پر ایک جنسی رد عمل ہے۔ ورنہ محبت، یاد، وفا، انتظار یہ شاعری کی اصطلاحیں ہیں۔ زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔'' پرند نے کہا۔

میں محبت سے انکار نہیں کر پاتا''

''یہ حقیقت تمہاری فطرت میں داخل ہو چکی ہے اور میں انسان کی فطرت سے انکار نہیں کرتا مگر میں ان فرسودہ روائیتوں کا قائل نہیں ہوں جن کی وجہ سے انسان، انسان نہ بن کر کچھ درمیانی سی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے مطابق زندہ رہے تب ہی حقیقی مسرت پا سکتا ہے۔ دراصل تمہاری سوسائٹی نے جو روایتیں بنائی ہیں مجھے ان سے انکار نہیں۔ میں محبت کا مخالف بھی نہیں ہوں۔ جانتے ہو نکہت جسے تم اب دل کی گہرائیوں چاہنے لگے ہو، وہ بھی اس روایت کی شکار ہے کہ محبت کی کامیابی یہ ہے کہ شادی ہو جائے .....لیکن محبت کی منزل شادی نہیں ہے...محبت ایک تمنا کا نام ہے.....جس کی تکمیل کی کوئی گنجائش نہیں.....یہ تو ایک راستہ کا نام ہے.....اور یہ ''پرائے آدمی'' کا غلط تصور وہ

لوگ رکھتے ہیں جو محبت کے مفہوم سے ناواقف ہیں۔ آج جو تم نے نکہت کی قربت چاہی تمہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا..... چوں کہ تم ایک پرائے آدمی ہو..... اس سلسلے کا شدید احساس ایک نامکمل انسان کی پہچان ہے'' پرند نے مدلل گفتگو کی۔

''لیکن بے حسی بھی، انسان کی پہچان نہیں'' اس نے کہا۔

میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، دراصل اپنی تہذیبی عظمت میں چار چاند لگانے کے لیے انسان نے جو قدریں مرتب کر لی ہیں انہیں کو مان کر اپنی زندگی گزارتے ہو کیا تم بتا سکتے ہو جو بیوی تمہارے قریب سو رہی ہے اس کے پرانے عاشق کو سلام کرتے اور لیتے وقت تمہیں پسینہ کیوں آجاتا ہے؟'' پرند نے بات مکمل کی۔

''نہیں..... نہیں..... اس سلسلے میں، میں نے اپنی بیوی سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا'' اس نے کہا۔

''یہ تمہاری عظمت ہے..... لیکن اس کے عاشق سے رقابت کا جذبہ یہ تمہاری روایت ہے'' پرند نے کہا۔

''یہی روایت، میری فطرت ہے'' اس نے کہا۔

کوئی فطرت نہیں، جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ دیکھو سچ وہ ہے جو سامنے ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے سمن مرجھا گئی، نکہت ایک احساس کا نام ہے۔ موت ایک تسلیم شدہ حقیقت اور یاد بس کبھی کبھی.....

ٹن..... ن ایک

ٹن..... ن ن دو

ٹن..... ن ن ن تین

ٹن..... ن ن ن ن چار

کلاک ٹاور نے بجائے۔ اس نے منہ میں سگریٹ لگائی..... زندگی بھی ایک

سگریٹ ہے انسان بھی مٹی کا بنا ہے اور سگریٹ بھی۔ دونوں جل کر مٹی بن جاتے ہیں۔ اور بس جیون ختم ....اور ایک دن میں بھی مر جاؤں گا، مجھے بھی کون یاد کرے گا؟ شاید کوئی نہیں۔ مرے مرنے کا کائنات میں کیا فرق پڑ جائے گا؟ اس کی ناک پر ایک مکھی آ کر کہیں سے بیٹھ گئی اور اس نے ہاتھ سے جھٹکا دیا۔ اچانک اس کے بستر کے سرہانے بنے روشندان کے گھونسلے سے چڑیا کا ایک جوڑا..... باہر نکلا.......... پھڑ..... پھڑ اس کے بستر کے چاروں طرف پھڑ پھڑ پھڑ اس کو پسینہ آ گیا، انگلیوں کے درمیان دبی سگریت سیل گئی۔ اس نے گھبرا کر سگریٹ کا آخری کش لیا............ اور سگریٹ زمین پر پھینک دیا........ چڑیا کے پروں کی سرسراہٹ سے دھوئیں کے مرغولے ادھر ادھر مبہم آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگے ......وہ بستر سے اتر کر زمین پر کھڑا ہو گیا......

''شی...... شی......... شی'' پھڑ...... پھڑ...... پھڑ.... 'چڑیا کتابوں پر بیٹھ گئی۔

''شی...... شی ...شی''...اس نے مسہری کے نیچے سے لاٹھی نکالی اور اس کے چاروں طرف بھاگنے لگا.... پھڑ..... پھڑ چڑیا کبھی کتابوں پر کبھی گھونسلے میں...... پھڑ ....پھڑ، اس کا چہرا سرخ ہو گیا... سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ ''آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا''

چڑیا روشندان پر بیٹھ گئی.... اس نے ڈوری کھینچنی چاہی تا کہ وہ کھڑکی میں دب کر مر جائے لیکن وہ پھر سے روشندان سے باہر نکل گئی۔

وہ مسہری پر آ کر بیٹھ گیا اور سانس تیزی سے چلنے لگا۔ اس نے اپنے حواس درست کئے ..... چوں. چوں. چیں. چیں... کائیں ..... کائیں ...... ٹیں ...... ٹیں ...... چیں ..... چیں ککڑوں کوں..... ککڑوں

اس نے کمرے کی کواڑ کھول دی اور باہر صحن میں کھڑا ہو گیا۔ آسمان رنگ بدل رہا ہے وہ زندگی بھر دیکھتا آیا ہے کہ آسمان رنگ بدلتا ہے۔ آسمان کی سیاہی ہلکی ہوتی جا رہی ہے

اور ستاروں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ لیکن پرندوں کی چہچہاہٹ بڑھ رہی ہے۔
چو.....چوں .....چیں...چیں .....کائیں .....کائیں .....ٹیں .....ٹیں.....ککڑوکوں
.....ککڑوکوں اس نے اپنے کانوں پر انگلیاں رکھ لیں پرند کی آوازیں دور مشرق سے آتی ہوئی محسوس ہوئیں اس کا جی چاہا کہ وہ پرندوں کے پر کاٹ کر ان کو اڑان سے محروم کر دے.....لیکن.....لیکن وہ اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے...سر میں درد ہو رہا ہے''

''نہیں'' اس نے اپنی بیوی کے شانے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا...بیوی نے اسے کاندھے کا سہارا دیا....اور مسہری پر لٹا دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے کریدنے لگی .....اسے سکون کا احساس ہوا۔ پتہ نہیں کون سے لمحہ اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں پر رکھ لیا.....دور کہیں سے اللہ اکبر.....اللہ اکبر . الصلوۃ خیر من النوم کی صدائیں آ رہی تھی۔ اس نے بھی اپنی آواز اللہ اکبر اللہ کہہ کر موذّن کی صدا کے ساتھ ملا دی.....

ooo

کھوکھلی گگر

''زندگی میں کبھی کبھی ایسے پل بھی آتے ہیں کہ انسان بے حقیقت پریشان ہوجاتا ہے۔'' وہ خود کلام ہوتا ہے اور سوچتا ہے یہ کیسی رات ہے جو اضطراب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آلامِ روزگار، نہ غمِ عشق ہے۔ آلامِ روزگار ہے نہیں کہ جینے کا مقصد دنیا نہیں اس لیے کبھی احوالِ پریشان ہوئے نہ منتشر۔ غمِ عشق بھی نہیں کہ محبت ایسی سخت چیز ہے کہ جس کے ساتھ لگ جائے رفتہ رفتہ آدمی کو اسی کا بنا دیتی ہے۔ فقر کا خوف بھی نہیں کیوں کہ مجرد ہوں اس لیے ماکولات کی تنگی بھی نہیں ---وہ نرم بستر سے حیران و پریشان اُٹھا اور بستر پر ایسے دونوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے شعلے سمیٹ رہا ہو۔ نیند تو کانٹوں کے بستر پر بھی آجاتی ہے اگر جسم تھکا ہو۔ سارا دن سخت محنت کرتا ہوں... پھر نیند کیوں روٹھی؟ ہاں نیند تب ہی ناراض ہوتی ہے جب سکون روٹھ جائے۔ اس نے چاروں طرف نظر پھیلائی کوئی اس کا مساعد و مددگار نہیں تھا۔ وہ بستر پر چت لیٹ گیا، آنکھیں بند کیں کہ قدرے سکون مل جائے لیکن ندارت۔ اس نے بائیں جانب کروٹ لی تنگیِ دل اور خوف کے شدید غلبہ کے سبب اس نے اچانک آنکھیں وا کیں شاید جہنم کا ڈر اور میدانِ حشر کے سوال نے نیند اڑا دی ہو۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھا دائیں جانب اسٹول پر رکھی ٹائم پیس پر نگاہ گئی۔ چار بجے تھے، کمرے سے باہر نکلا اوپر آنکھ گئی صاف و شفاف آسمان پر ستارے مسکرا رہے تھے۔ صبح کاذب کی ایک لکیر چمک رہی تھی۔ اجالا ہونے سے پہلے وہ سکینہ کی تلاش میں نکل پڑا... اس نے سوچا تابستان

سے نکل کر سکونِ قلب کے لیے گلستان کو نکلوں تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوب صورت باغ ہے اس کی سیر کی جائے ممکن ہے مناظرِ فطرت وجہ مسرت بنے۔

کالی سڑک تاحدِ نظر پُرسکون لیٹی ہوئی ہے اسے انسان کی بے چینی پر ترس آیا۔ سڑک کے دونوں جوانب شٹر لگی دوکانیں خاموش ہیں۔ فٹ پاتھ کے اس طرف درختوں پر غنودگی طاری ہے۔ اکّا دُکّا ٹو وھیلر یا فوروھیلر اس کے برابر سے شٹ سے گزر جاتی خاموشی اس دوران بکھر جاتی وہ سڑک کے کنارے احتیاط سے چلتے ہوئے سہم جاتا اور چونکتے ہوئے ان کی آوازوں کی طرف دیکھتا اور پھر سیدھا دیکھنے لگتا۔ دائیں جانب مڑ کر ایک فرلانگ چلنے کے بعد باغ کے دروازے پر پھڑ بچھائے ایک سادھو چوکڑات جمائے دھیان میں مگن ہے وہ بھی اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔

''مہاراج میں پرماتما کو پانا چاہتا ہوں، مجھے راستہ دکھائیں۔'' اس نے درخواست کی۔

سادھو نے آہستہ آہستہ گڑبہ آنکھیں کھولیں۔ ''یہ بتاؤ کہ تم نے کبھی کسی سے پریم کیا ہے۔''

''مہاراج میں نے آج تک کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ میری تہذیب بچپن سے مذہبی ہے۔''

''سوچ کر بتاؤ کبھی کسی سے پریم کیا ہو، کسی کو چاہا ہو۔'' سادھو نے پوچھا۔

''میں نے پرماتما کے سوا کسی کو نہیں چاہا۔''

سادھو نے تیسری بار بھی وہی سوال کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ سادھو کو اس کی بات پر یقین نہیں ہو رہا ہے، شاید سمجھ رہے ہیں کہ میں دنیا میں کسی نہ کسی موہ جال میں ضرور پڑا ہوں۔ اس نے بھی اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے ہر تعلق کو یاد کیا لیکن اسے ایسا کوئی پل یاد نہیں آیا جب وہ کسی کی طرف متوجہ ہوا ہو، اس

نے پھر سختی سے انکار کرتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

سادھو مایوس ہوکر بولا ''تب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا جس نے کبھی سنسار میں کسی سے پریم نہیں کیا۔ وہ بھلا پرماتما سے کیسے پریم کرسکے گا؟ تمہارے بھیتر اگر پریم کی چنگاری موجود ہوتی تو میں اسے آگ میں بدل سکتا تھا۔ زندگی تو پریم کے بنا چل نہیں سکتی اور تمہیں اگر اس کا احساس نہیں ہے تو پرماتما جیسی غیر مجسم ہستی کے لیے تو اس کے بغیر راستہ اور بھی مشکل ہے۔''

وہ اور زیادہ بے چین ہوگیا۔ وہاں سے اُٹھا، اضطرابی کیفیت لیے باغ کا دروازہ عبور کیا۔ سورج آسمان کی کھڑکی سے باکرہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ کرنیں سونے اور چاندی کا برادہ درختوں پر بکھیر رہی تھیں، پرندوں کی چہچہاہٹ سے باغ گونج رہا تھا۔ درختوں کے درمیانی راستے سے گزر کر وہ فوّارہ پر آگیا۔ چہار راستے فوارہ پر ختم ہورہے تھے۔ ان راستوں کے دونوں طرف گلاب، گیندا، چمیلی اور موگرا کی روشیں لگی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو سے خوب صورت منظر مہک رہا تھا۔ پودوں کی پتیوں پر شبنم کے موتیوں سے ہیرے جیسے مختلف رنگ پھوٹ رہے تھے۔ سورج ثیبہ کی طرح جیسے ہی پردہ سے باہر نکلا وہ سوچنے لگا اگر پرماتما مل گیا تو سکونِ قلب کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس نے واپسی کے لیے لمبے لمبے ڈگ بھرے دوبارہ باغ کے دروازے پر سادھو کے قریب پہنچ گیا جس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔

''مہاراج پرماتما کی تلاش میں لوگ راج پاٹ چھوڑ دیتے ہیں، لیکن میرے پاس چھوڑنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''غم تو چھوڑنے اور چھوٹنے پر ہوتا ہے۔'' سادھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھولوں کی مسکراہٹ اور مہک اس کی روح میں اُتر گئی اور وہ تلاش میں خالی ہاتھ نکل پڑا۔ سڑک ابھی تک سونی پڑی تھی، سادھو کے بول وچن لیے خاموشی سے فٹ پاتھ پر

دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات پرندوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ ''تمہارے بھیتر اگر چنگاری موجود ہوتی تو میں اسے آگ میں بدل سکتا تھا۔'' وہ سوچنے لگا عشق وہ دریا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا، عقل مند انسان بھی اس میں ڈوب جاتا ہے اور میں ایک بے عقل ناتجربہ کار... اس نے متذبذب خیالات کو ایک جانب جھٹکا۔ ہر جانب سے چشم پوشی کی، بائیں طرف گھر میں قدم رکھا... اپنے اندر ٹھہراؤ پیدا کیا۔ ذہن میں ارتکاز کی سعی میں سر کھپایا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں نظر کائنات پر ٹھہری کیوں نہ ٹھہرتی؟ کائنات خوب صورت ہے! شاخِ گل کی طرح نازک، سرو قد، چاندنی بدن، بولے پھول جھڑیں، خوشبو اڑے، چلے صبا جیسی، روشنی کی طرح چنچل ایک محیر العقول مخلوق جو بیان کی گرفت سے دور۔

''کائنات تم بہت حسین ہو'' اس نے کہا۔

وہ اپنی تعریف پر اترائی، ذرا مسکرائی پھر سوچنے لگی تخلیق کی تحسین سب ہی کرتے ہیں لیکن تخلیق کار کو بھول جاتے ہیں۔

''میں اگر خوب صورت ہوں تو کیا؟ اور اس میں میرا کیا ہے؟ اگر میرا ذرّہ برابر بھی کچھ ہوتا تو میں دائم خوب صورت ہوتی۔'' اس نے کہا۔

''نہیں... نہیں... میں سچ کہتا ہوں... مرد و زن سب ہی تمہاری خوب صورتی پر فدا ہیں۔''

''تو... پھر یہ دل کس کو دوں؟... (تھوڑے وقفہ کے بعد) مجبوری یہ ہے کہ ایک انار سو بیمار۔'' وہ بڑی بے شرمی سے ہنسی۔

''میر... ے... بارے میں... کیا خیال ہے؟'' خوشامدانہ لب و لہجہ۔

''خیال... صرف اس لیے کہ تم میرے اوپر فدا ہو۔ یہ فدائیت تو دوسروں میں بھی موجود ہے۔'' اس نے طنز کیا۔

''میں تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں... حکم کرو تو انسان سے شیطان بن سکتا ہوں۔''

''یہ تو... دوسرے بھی کرسکتے ہیں میرے حکم دیے بغیر بھی۔'' وہ بے حیائی سے مسکرائی۔

چند لمحوں کے لیے سکوت طاری ہوگیا۔ کائنات چپ تھی، فطرت بول رہی تھی۔ دھوپ چٹک رہی تھی، ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ آسمان صاف وشفاف تھا۔ دھنک خوش نما رنگوں کے ساتھ کمان کی طرح ایک کنارے پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے نظر اُٹھا کر منظر کو دیکھا۔ وہ سوچتی ہے تخلیق کے حوالے سے کیا خالق کو نہیں پہچانا جاسکتا۔ فن کے حوالے سے فن کار کو سمجھنا مشکل ہے لیکن فن کار کے حوالے سے فن کو سمجھنا آسان ہے۔۔

''تمہاری نرگسی آنکھیں مہ نوش کے سرور کو بھلا دیں، گلاب پنکھڑی ہونٹ فضا کو مہکا دیں، سیاہ زلفیں جہاں بکھر جائیں، پریم ورشا سے منظر خوش رنگ ہوجائے۔''

''مجھے معلوم ہے شراب کا نشہ عارضی، پھولوں کی خوشبو قلیل وقتی، سیاہ زلفوں کی ورشا کبھی کبھی۔'' کائنات نے بے رخی سے جواب دیا۔

کائنات کی صاف گوئی سے اس کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ سوچنے لگا صنفِ نازک کو اپنی توصیف بہت پسند ہوتی ہے۔ ایسے عاشق کے اوپر وہ دل وجان سے نچھاور ہوجاتی ہے اور وہ بھول جاتی ہے کہ سامنے والا اسے خلوصِ دل سے پیار کرتا ہے کہ خوب صورت فریب کرتا ہے۔ اسے تو بس یہ اچھا لگتا ہے میں بدصورت ہوں پھر بھی اسے خوب صورت لگتی ہوں۔ میرا حسن وجمال فانی ہے، پھر بھی اسے لافانی لگتا ہے۔

''تم میرے ہوش وحواس پر چھا گئی ہو۔'' اس نے گفتگو جاری کی۔

''یہ میرے حسن وجمال کا کمال ہے، میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔'' کائنات نے

کہا۔

''تمہاری ادائیں آبِ رواں کی لہروں کی طرح ہیں۔''

''جب ہوا سبک خرام ہوتی ہے تب ہی لہر بنتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''پانی کی لہروں کا کوئی بھروسا نہیں... بظاہر سطح آب پر خاموش ہوتی ہیں لیکن لہروں کا بننا اور بگڑنا ہواؤں کا چلنا ہوتا ہے۔''

''وضاحت کرو۔''

''تمہاری نظروں کا کمال ہے... ورنہ جمال اور بے جمال میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔''

''بے شک جسدِ آب وگلِ ماں کی طرح طاہر، ممتا کی طرح پاکیزہ ہے لیکن سطح آب سے تہِ آب کا سفر کرو تو کائنات کے اس اندھیرے سے واقف ہو جاؤ گے جو طوفان کی مانند سیاہ اور تباہ کن ہے۔''

وہ مایوس ہو کر حیران و پریشان منہ لٹکائے بیٹھ گیا اُسے سادھو پر بہت غصہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کائنات اپنے حسن و جمال میں گرفتار کرتی ہے اور اپنی بے رخی سے اپنے وصال کے خواہش مندوں کو ہلاک کرتی ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں سے بھاگتی ہے... ''لیکن کب تک بھاگے گی'' وہ بُدبُدایا۔

اس نے بُدبُدانے کی آواز سن لی اور اسے گھور کر دیکھا۔

''اگر تیری محبت میں نے اوڑھ لی تو میرے پاؤں ننگے ہو جائیں گے اور سر پر اوڑھنی نہ رہے گی۔ میں نے ننگ و نام ہو جاؤں گی۔'' کرخت لہجے میں کہا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

وہ کائنات کے قریب سے اُٹھا... کھلے آسمان پر نظر ڈالی، نیلے آسمان کا لامتناہی

سلسلہ صاف وشفاف پوری کائنات پر سائبان کی طرح لٹکا تھا۔ اس نے دن میں ستارے تلاش نے کی کوشش کی۔ ستارے توڑنے کے لیے کمر پر پیر رکھنا ضروری ہے۔ صرف محبت کی سیڑھی سے آسمان نہیں چھوا جاسکتا۔ وہ دوڑنے لگا... دوڑنے لگا... ایسی دوڑ جس میں پیچھے مڑنے کا موقع نہیں ملتا... اسے معلوم تھا... پیچھے مڑ کر دیکھنے میں پتھر ہونے کے امکانات قوی ہوتے ہیں... وہ سوچنے لگا اگر میرے پاس دولت وزر ہوئی تو شمس وقمر کو تسخیر کرلوں گا۔ آسمان کی بلندی پر چڑھ جاؤں گا... صبا میرے آگے پیچھے رقص کرے گی۔ چاندنی میرا تعاقب کرے گی اور روشنی میرے پیروں تلے ہوگی... پھر بھی یہ کائنات کے مثل نہیں... کائنات تو کائنات ہے... بلا کی خوب صورت ہے وہ ستارے اس کے بدن سے لپٹے ہیں۔ چاند وسورج ہالے کی صورت کانوں میں لٹکے ہیں۔ خوشبوئیں اس کے ہر عضو سے پھوٹتی ہے۔

اس نے فیصلہ لیا کہ اپنی محنت سے سنگلاخ زمین کو نرم وہموار کر کے دم لوں گا۔ یہ انفرااسٹرکچر کا زمانہ ہے کیوں نا تعمیرات کر کے کائنات کو خوب صورت بنایا جائے۔ اس نے دیہی علاقوں کی طرف نظر اُٹھائی، اس کی نظر کا تعاقب ایک دیہاتی شہری نما انسان نے کیا اور پہچان لیا کہ ایک معاشی حیوان شب وروز کے پھیر میں پڑ گیا ہے۔ اس دیہاتی نے کہا شہر مگرمچھ کی شکل میں دیہات کو نگلنے کے لیے بے چین ہے۔ آپ لوگ متحد ہوکر کھیتی بچاؤ آندولن شروع کریں۔ اگر فطرت میں مداخلت ہوگئی تو کائنات کا توازن بگڑ جائے گا۔ عمارتیں، صنعتیں کائنات کے خوش مناظر کو نگل جائیں گی، انسان تازہ ہواؤں سے، سورج کی روشنی سے، چاند کی چاندنی سے، بچوں کی معصوم کلکاریوں سے محروم ہوجائیں گے۔ سوچو پھر کیا ہوگا؟ کائنات بدصورت ہوجائے گی!

آبادی کے ساتھ عمارتوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کو نہ حکومت روک سکی، نہ فطرت، دولت مافیا تو حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر اور تجارت کے نفع ونقصان سے

آگے تر کسی چیز کی جانب توجہ نہیں کرتے۔ اب چاروں طرف فلک بوس عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ کھیت کھلیان، پھل پھول، درخت پودے، چرند و پرند، شہد و شیر، باغات و نباتات غرض ہر شے ناپید کیا ہوئی کہ رشتے ناطے، انسانیت، تعلقات، اجتماعیت، دولت کے مول فروخت ہونے لگیں۔ وہ دوڑ رہا ہے... دوڑ رہا تھا، پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی اس نے قسم کھائی تھی... وہ دوڑ رہا ہے گر کبھی رُکتا تو صرف آسمان کو دیکھتا، تاحدِ نظر سورج چڑھتے دیکھتا، زمین کو پیروں تلے روندتا۔ اس درمیان اسے کائنات کا خیال آتا... وہ بھول گیا کہ کائنات خوب صورت ہے پھر بھی اسے پانے کی جستجو تھی... آرزوئے کائنات ابھی زندہ... جب بھی زندگی سے فرصت ملتی اپنے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتا اور حیرت افسوس کرتا۔ ایک رات وہ بہت بے چین تھا۔ کائنات اس کے دل و دماغ پر سوار تھی۔ آسمان تلے ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے روشن دانوں سے ہلکی ہلکی روشنی ٹمٹما رہی تھی جیسے زمین پر بھی ستاروں کا جال بچھ گیا ہو۔ یہ ستاروں کی کائنات عجیب و غریب ہے ان کی تاثیرات بھی حیرت افزا ہوتی ہیں۔ عالم علوی کے تابع کوئی ستارہ میرے لیے ایسا سعد ہوا کہ کام بنتے چلے گئے، لیکن عالم سفلی کا یہ کون سا نحس ستارہ ہے کہ میرا سکھ چین روٹھ گیا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کائنات کو پانے کے لیے دیگر اشیاء جات کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی لیکن فکر سیم و زر کے علاوہ اب یہ کون سی فکر ہے کہ روز نے شب کو چاٹ لیا۔ رات بھی دن جیسی ہوگئی... دن ہے تو نیند نہیں، خواب نہیں۔ خواب نہیں تو زندگی نہیں... رات کی سیاہ چادر پھاڑ کر دن نمودار ہو تو شاید سکون ہو۔ وہ نرم بستر سے اُٹھا کھڑکی پر آیا۔ زمین کے ٹمٹماتے ستارے دیکھے جن کی روشنی غائب ہو چکی تھی۔ آسمان دیکھا، جھلملاتے ستاروں کے درمیان صبح کا تارا چمک رہا ہے۔ اسے قدرے سکون ہوا جیسے محشر کی رات سے نجات ملی ہو۔

صبح ہو چکی ہے، سورج رفتہ رفتہ بے پردہ ہو رہا ہے۔ اس نے زمین کو دیکھا۔

اسے لگا پیروں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہے۔ خوب صورت مناظر غائب ہیں۔ خوش نما پھول، راحت افزا کھیت، دل فریب سبزہ ناپید ہے اسے محسوس ہوا آنکھوں کی بصارت چلی گئی۔ اسی لمحہ اس نے آنکھیں بند کرلیں، کان آسمان کی جانب لگا دیے، خوش گلو پرندوں کی چہچہاہٹ سے سماعت محروم ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور ہوا خوری کے لیے عمارت کی چھت پر چڑھ گیا۔ ہوا بند ہے لیکن اس کی ہوا بندھ گئی تھی کیوں کہ دیہات شہر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ چاروں طرف عمارتوں کے درمیان اس کی عمارت سب سے اونچی ہے، اس کی عمارت سے چار فرلانگ دور دائیں جانب مکانات اور جھونپڑے اسے بہت چھوٹے چھوٹے اور بدنما نظر آرہے ہیں۔ کھیتوں پر عمارتوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ یہ سوچ کر وہ زیرلب مسکرایا... اور چھت سے اُتر کر اپنے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

کھیت نہ رہے، کھلیان بھی ختم ہوگئے۔ کسان بے دست و پا ہوگئے۔ ایک بڑا طبقہ غریبی کی بھٹی میں سلگنے لگا۔

فادر اگسٹس موٹا نے جب ان لوگوں کی بدحالی دیکھی تو وہ تڑپ گئے۔ ”تم لوگ بھوکے مرتے ہو، پیٹ کا ایندھن تلاش کرنے کے لیے ادھر اُدھر مارے مارے گھومتے ہو، تم سبھی کو خوش حال بنا دینے کے لیے تو یہ سیٹھ ہی کافی ہے۔“ اس بیان پر اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ”فادر یہ سیٹھ بہت بخیل ہے، اسے کسی کی فکر ہے ہی نہیں۔ چاہیں تو آپ بھی کوشش کر کے دیکھ لیں۔“

فادر نے کہا ”کوشش کرتا ہوں۔“

فادر نے سیٹھ کے دروازے پر دستک دی، اس نے باہر نکل کر فادر کے لیے احترام سے آنکھیں بچھا دیں۔ اپنے خوش حال اور خوش مستقبل ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا: ”کبھی کبھی تشریف لا کر میرے گھر کو عزت بخشیں۔“

فادر نے کہا ''میں ایک راہب ہوں، تاریک الدنیا ہوں، کچھ پاس میں رکھتا نہیں، پر ایک چیز میرے پاس ہے اس کے ہونے میں بہت پریشان ہوں۔ ایک سوئی ہے جو میں اپنے پھٹے کپڑے کو سلنے میں استعمال کرتا ہوں آپ اسے رکھ لیں۔ آپ بھی میری ہم عمر ہی ہیں۔ لگتا ہے دونوں کی رفتار ایک سی ہوگی، پھر آپ سے بہشت میں ملاقات ہوگی۔ تب آپ یہ سوئی مجھے واپس کر دینا۔

اس نے کہا ''فادر آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ مرنے میں سب کچھ ساتھ نہیں جاتا۔ گیانی ہو کر بھی آپ اتنے بھولے پن کی بات کیوں کرتے ہیں؟''

فادر بولے ''گیان کی بات تم نے مجھے سمجھا دی، پر تم کیوں جمع کر رہے ہو۔ اس فانی کائنات کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہو؟''

وہ فادر کی بات کو سمجھ گیا اور کہنے لگا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کائنات میں سچ اور جھوٹ دونوں کو ٹھیک طور سے سمجھ لیں اسی میں حیات کی کامرانی ہے۔''

فادر کی باتوں کا اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا۔ وہ سوچنے لگا جو کچھ کیا سب بیکار ہے، زندگی چاہے کتنی زیادہ ہو جائے بہر حال کم ہے۔ ایسی زندگی کے پیچھے پڑنا، پیچھے لگنا جو کسی طرح بھی اپنے پاس ہمیشہ نہیں رہ سکتی، بے وقوفی کی انتہا ہے۔ کائنات اپنے چاہنے والوں سے بھاگتی ہے، اپنے وصال کے خواہش مندوں کو ہلاک کرتی ہے۔ اس کی توجہ میں بھی آفت اور مصیبت سے امن نہیں ہے۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا، کائنات جمیل ہے لیکن رذیل ہے، کائنات خوب صورت ہے لیکن جبت (بے حقیقت) ہے۔

حیض و نفاس، بول و براز سے آلودہ یہ کائنات جس کی تخلیق گندے قطرے سے ہوئی تولد سے پہلے غلیظ کھانا، پھر بھی اس کا کیوں دیوانہ ہوا؟ لعنت اس کائنات پر! اس نے کائنات سے اپنے پروں کو سمیٹ لیا اور آمادۂ سفر ہوا... ایسے مقام کی تلاش میں جہاں قلب کو سکینہ، دل کو راحت اور روح کو طہارت نصیب ہو... اس نے کائنات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ گیان

حاصل کر کے دھیان کے راستے نکل آیا...وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا...سوچتا رہا کہ بدن کا چراغ آنکھ ہے، آنکھ درست ہوتو سارا بدن روشن ہو جائے۔ اگر آنکھ خراب ہوتو سارا بدن تاریک ہو جائے، پس وہ روشنی مجھ میں ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا کائنات پیچھے چھوٹ گئی ہے آگے کی جانب نگاہ اُٹھائی ----دور سرمئی کہسار پر رُکا ہوا نیلا آسمان سفید بادلوں کی پوشاک زیب تن کیے تن کر کھڑا ہے، چاروں طرف دھوئیں کے مرغولے سائبان کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈھلان پر زیتون کی روشیں آبِ رواں کی لہروں جیسے پھیلی ہیں۔ پہاڑ کے قدموں کے نیچے سبز مخمل بچھی ہے۔ ایک فرلانگ کی دوری پر آئینہ کی طرح صاف و شفاف چشمہ میں آفتاب کی روشنی کا عکس ٹھنڈے پانی کے سنگ محوِ رقص ہے۔ ایک کنارے سے تھوڑے فاصلے پر ساگوان سے بنی کٹیا کشتی کی طرح زمین پر رکھی ہے، اس کے دروازے پر انگور کی بیل لٹکی ہے۔ چاروں طرف خوش گلو پرندوں کی نغمہ سرائی خوب صورت وادی میں شعلہ سا لپک جائے کا منظر پیش کر رہی ہے۔ خوش منظر دیکھ کر اس کی بصارت لوٹ آئی اور خوش آواز سن کر جیسے سماعت لوٹ آئی...جلوۂ حق دیکھ کر اس نے خوش کلامی کی ''سبحان اللہ! بادشاہت، قدرت اور جلالت ہمیشہ تیری تھی، تیری ہے، تیری رہے گی!''

گوشہ نشینی کے لیے نگاہِ انتخاب کٹیا پر گئی اور کنجِ تنہائی میں مصلّٰی بچھا دیا...چشمہ پر وضو کیا رب العزت کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے...اے معبود! کائنات کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ کائنات کا حسن و جمال فانی ہے تو لافانی ہے تیرا کمال و جمال لافانی ہے۔ زندگی کی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی میرے اندر بلند حالت پر پہنچنے کی فطری پیاس نے تونس کی صورت اختیار کر لی۔ یہ غلطی ہے میری، رحم کر، درگزر کر دے۔ اے مالک جس بار کو اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر۔ اے پروردگار اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ رہبرِ معتبر جب تو ہمیں سیدھے راستہ پر لگا چکا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو!...''

اس نے آنسوؤں کو پونچھا اور دستِ دعا کو چہرے پر پھیرا... یوں عبادت اور ریاضت میں لگ گیا۔ ایک عبادت گزار بندے کی طرح لوگوں سے الگ رہ کر ذکرِ خداوندی میں مشغول رہا کرتا۔ ایک طویل مدت تک اپنی عبادت گاہ میں عبادت کرتا رہا... پیاس لگتی چشمہ کا پانی پیتا، بھوک لگتی انگوروں سے مٹالیتا... ایک عابد کی حیثیت سے اس کا شہرہ سارے عالم میں ہوگیا۔

ایک رات اُجلے نیلے آسمان پر ستارے اپنی جھلملاہٹ سے مسکراہٹ بکھیر رہے ہیں۔ چاندنی چاندی کی پرت کی طرح سبزے پر بچھی ہے۔ چاند کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر بکھر رہی ہے۔ چشمہ کے اندر عکسِ ماہِ کامل رقص وسرور میں محو ہے۔ چاروں طرف سکون اور سکوت طاری ہے۔ موسم خوش گوار ہے۔ درخت سجدہ ریز محویت کے عالم میں ہیں۔

چاندنی کی قاشیں کواڑوں کی درازوں سے کٹیا میں داخل ہورہی ہیں۔ وہ اپنی عبادت میں مصروف ہے، اچانک دستک ہوئی...

اس نے دروازہ کھولا۔ چاندنی کا سایہ اندر پھیل گیا۔ دروازہ پر ایک حسین وجمیل عورت آستانہ کے قریب کھڑی ہے۔

''میرا گھر کافی دور ہے لہٰذا مجھے اپنے گھر میں آج کی رات پناہ دے دو۔''

اس نے نگاہ اوپر اُٹھائی، عورت سجی سنوری مسکرا رہی ہے۔ اس کے ملبوسات سے خوشبو پھوٹ رہی ہے۔

''کائنات...'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''یہ زیب وزینت میں نے آپ کے لیے اختیار کی ہے اور نگاہِ التفات اس پر ڈالی۔''

وہ خاموش رہا...

''تیرا عشق میری خاموشی اور اعراض کا سبب بنا۔ کوشش کی یہ راز رہے لیکن بے سود رہا۔'' کائنات نے اظہار کیا۔

وہ پھر بھی خاموش رہا...

اس نے اپنے لباس کو بدن سے جدا کیا اور عابد کو اپنے خوب صورت بدن کی جانب دعوتِ نظارہ پیش کرنے لگی۔

اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں... فضا میں تکدّر آمیز سکون پھیل گیا... خاموشی کی سائیں سائیں سانپوں کی طرح پھنکارنے لگی... نگاہِ طلب آسمان کی جانب اُٹھائی... آسمان پر بجلی سی تڑکی... ربّ ذوالجلال کی نگاہِ کرم ہوئی... اس نے نگاہِ جلال کائنات پر ڈالی... اچانک شعلے لپکے... چاروں طرف آگ ہی آگ... وہ جل کر خاک ہوئی اور خاک میں مل گئی۔ وہ اپنے مقامِ عبادت سے اُٹھا... باہر نکلا روشن چمک دار رات ہے، چاندنی کھل رہی ہے، ستارے مسکرا رہے ہیں... موسم خوش گوار ہے اس نے مغرب کی جانب دیکھا ایک نور سا چمکا اور وہ اس نور میں سرتاپا ڈوب گیا۔

○○○

حصار

اب فردوس میرے سامنے ہے لیکن اس سے پہلے ایک طویل عرصہ تک آتشِ فرقت سے میری آنکھیں پگھلتے ہوئے غم میں نم ہوتی رہی تھیں۔ وہ جو کبھی مرکزِ نگاہ تھی، میری منزل تھی اب خوابِ منزل ہے، خواب جو حقیقت کے پسِ پشت ہوتا ہے۔ حُور کا وجود اور اس کا خوبصورت ہونا اس لیے حقیقت ہے کہ وہ میری مسہری پر سوئی ہے اور مجھے بیدار کر رہی ہے لیکن میری بیداری کے عالم میں بھی وہ ہمیشہ دسترسِ نگاہ سے دور رہی ہے شاید اس لیے کہ ہمارے راستے الگ منزلیں لاپتہ' تہذیبی حدود ایک، سیاسی سرحدیں جدا۔ میرے ساجن اس پار، میں اس پار۔ او میرے مانجھی لیکر چل ندیا پار۔۔ وہ ندی کی طرح سیدھی سادی، بہتے پانی کی طرح نرمل اور شیتل، لہروں کی مانند نازک اندام، زیرِ آب ڈوبی ہوئی آفتاب کی پہلی کرن، میرے اندر چبھن سی ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے عجلت میں لکیر بنائی پہلے دلوں کے بیچ ریکھا کھینچی ہوتی۔ اِس وقت یہاں وہاں سائیں سائیں کا شور ہے اور چاروں طرف سناٹا ہے۔ بیڈروم کی خاموش دیواریں بول رہی ہیں باہر سے ہواؤں کی چاپ اور سردی اندر داخل ہو رہی ہے۔ میں نے سگریٹ سلگایا فضا میں دھوئیں کی لکیریں دنیا کے نقشہ کا جال بننے لگیں زندگی کے دھندلے رنگ گہرے ہونے لگے۔ کل اور آج کا فرق مٹ گیا ہے جیسے گزرے وقت اور موجودہ لمحات کے درمیان کی دیوار ٹوٹ گئی ہو۔ تقریباً تیس سال پہلے کا پھونس بنگلہ جو اب سمنٹ کا بن گیا ہے لیکن اب بھی پھونس بنگلہ

ہے جیسے تہذیب کی جڑیں روایت میں اور جدت کا رشتہ قدامت میں پیوست پھر نیا کیا اور پرانا کیا؟ شناخت تو وہی ہے جو اس کی بنیاد ہے۔

پھونس بنگلے میں پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس مس تھومس ایک خوش مزاج، بے تکلف اپنی تہذیب کی پروردہ خاتون تھیں۔ میں انٹرول میں ان کے ساتھ چائے کی پیالیوں میں تھکن اور بچوں کی چیخ پکار انڈیلتا لیکن فردوس کا چائے میں شریک نہ ہونے کا رویہ باعث تشویش تھا شاید اس رویہ کا میرے اوپر گہرا نقش اس لیے ہوا کہ مغربی اثرات کی ہوا اسے نہیں لگی تھی حالانکہ پچھا دیہ ہواؤں کی زد میں پورا ایشیا ایسا کراہ رہا ہے کہ مغربی اور مشرقی فاصلہ قرب و بعد میں تبدیل ہو کر یہ پہچان بھی ختم ہوگئی ہے کہ مغرب کیا اور مشرق کیا ہے؟

فردوس آسمانی رنگ کی بیڈ شیٹ پر آسمانی مخلوق کی طرح مجھے جگا رہی ہے عمر کے اس ڈھلان پر بھی کھنڈرات، عمارت عظیم ہونے کی دعوے داری آج بھی کر رہی ہے اور کل بھی کرتی تھی۔

''تم ندی جیسی معصوم ہو''

''ندی کی معصومیت - طہارت میں چھپی ہے''

''کبھی کبھی اس میں کٹاؤ بھی آتا ہے''

''جب ساحل کمزور ہوتا ہے''

کھڑکی پر ٹنگے پردوں کی سرسراہٹ سے چونک گیا ادھر ادھر نگاہیں گھمائیں..... ہاں سچ کہا تھا ساحل جب کمزور ہوتا ہے تب ہی ہلکے سے طوفان کی آہٹ سے پانی ادھر ادھر نکاسی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور ندی بے قابو بھی ہو جاتی ہے۔ میں اس وقت یہی سوچتا تھا کہ اگر وہ ندی ہے تو ساحل کے مضبوط ہونے کا اشارہ میری طرف ہے اگر وہ خود ہی ساحل ہے تو میں یہ کیوں بھول جاؤں کہ عورت ہوتی ایسی ہی ہے؟ پھر وہ تو فردوس ہے جو رات اور دن فردوس کا خواب دیکھتی ہے۔ وہ اِس وقت بھی گہری نیند میں محو

خواب ہے دائیں ہاتھ رخسار کے نیچے دائیں کروٹ دونوں پاؤں میں ہلکا سا خم، کمر کا جھکاؤ دوج کا چاند جیسے ہالے میں بدن کے نشیب و فراز سمیٹے ہوئے میرے سامنے روحانی خوشی کا سبب ہے۔

میرے دیکھنے کا اشتیاق روز افزوں بہانے تلاش کرتا تھا لیکن فردوس کا پردہ سے باہر ہونا مذہبی روایت کے ٹوٹنے کا اندیشہ ستاتا تھا۔ مگر دل ہے کہ ہر دیوار کو توڑنے کے لیے کوشاں تھا۔ ایک روز اچانک کھڑکی کے پٹ کھلے تھے سرد ہواؤں کے جھونکے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی طلباء میں مصروف، اپنے حسن سے بے پرواہ تھی۔ شاید اس کو یہ گمان ہو کہ تنہائی کی آنکھ نہیں ہوتی اور تیرِ نگاہ کے نشانہ سے بھی دور، اس کا یقین تھا۔ چاند چہرے پر گیسو چلمن کی طرح بکھر گئے تھے ان کو ہٹانے کا خیال جیسے ہی ذہن میں آیا دبی سگریٹ کے شعلے سے میری انگلی جل گئی تھی اور اس وقت ایک ٹیس سی میرے سینے میں اتر گئی تھی۔ آج اس سے مل کر دل کی بیتابیاں اور بڑھ گئی ہیں۔ اچانک بن اطلاع ملاقات ہونے سے میری زبان گنگ اور منھ کھلا رہ گیا۔

''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں.....

''جب تم گئی تھیں تب بھی تم نے حیران کر دیا تھا''

''زندگی ''حیرانی'' کا نام ہی ہے۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے اچانک ہوتا ہے''

گئی کیوں تھیں''

''والدین کی مرضی سے''

''آئی کیوں ہو؟''

اپنی مرضی سے''

''ڈر نہیں لگتا''

''اب یہ عمر ڈرنے کی نہیں ہے، دوسرے شادی کے بعد عاشق سے ملنے میں

عورت کوکوئی خوف بھی نہیں ہوتا''

''مطلب شادی عورت کے لیے آمدورفت کا پاسپورٹ ہوتا ہے''

وہ مسکرائی ....میں اس کی مسکراہٹ میں کھو گیا سوچنے لگا۔فردوس اعلیٰ حسب و نسب کی آسمانی مخلوق نیچ ذات زمینی مخلوق کے بستر پر دراز دنیا سے بے خبر سوئی ہوئی ہے لیکن اس آخری رات کو جب وہ ملاقات کرنے آئی تو دنیا سوئی ہوئی تھی۔

''نیچ ذات سے مجھے عشق کرنے کا حق نہیں'' اس نے کہا تھا

''تو کیا اپنی مرضی سے انسان اعلیٰ ذات میں پیدا ہوتے ہیں''

''تمہیں تو ہماری طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرنی چاہئے''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ نائی چھوٹی ذات کے ہوتے ہیں، ایسا ابّا کہتے ہیں''

''تم کیا کہتی ہو''

''دھرتی اور گگن کا ملن آنے والے بھونچال کی سوچنا ہے'' اس نے کہا

''ایک دھوکا ہے.... ہر طرف'' اچانک میرے منھ سے نکلا

چاروں طرف خاموشی طاری ہوگئی آسمان چپ تھا اور زمین گونگی ہوگئی تھی۔اس وقت تلملانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا جی چاہتا تھا کہ ان صحیفوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں جن میں انسانوں کی اس قدر بے حرمتی اور تذلیل کی گئی ہو۔سوچتا تھا جب تک راز رہے سلسلہ عشق جاری رہتا ہے۔افشاں ہونے پر بدنامی اور ناکامی کا سبب بنتا ہے۔میری محبت بھی آزار جاں بن گئی۔فردوس نے اطلاع دی تھی تم سے دور کرنے کے لیے میری شادی پاکستان میں پھوپھیرے بھائی سید ثروت سے کر دی گئی ابّا کا خیال ہے عشق وہ آگ ہے جس میں قریبی پہلے جھلس جاتے ہیں خاکستر میں دبی چنگاری بھی بنا پھونکے شعلہ بن جاتی ہے۔

اس نے کہا ''ایک تو غم جلاوطنی کا.....

''دوسرا''

''بڑا غم اپنا وطن مان کر بھی بے وطنی کا احساس رہتا ہے'' اس کی آنکھیں بھیک رہی تھیں

''وہ تو اپنوں کا وطن ہے''

''لیکن مہاجروں کا نہیں...اپنوں ہی کے ہاتھوں مرتے ہیں'' اس نے کہا

''یہاں اپنا وطن ہوتے ہوئے جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہیں''

''وہ کیسے؟''

''فرق اتنا ہے کہ غیروں کے ہاتھوں مرتے ہیں''

''خیر سے شہید تو کہلاتے ہیں'' طنزیہ مسکرائی

''عجیب تذبذب کا عالم ہے کہ آدمی فردوس چاہتا ہے اور مرنا بھی نہیں چاہتا''

اس نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی جس کے کوئی معنی نہیں تھے

''تمہارا شوہر کیا کرتا ہے''

''مکانات بناتے ہیں کنسٹرکشن کا کاروبار ہے''

''ڈی کنسٹرکشن بھی کرتے ہوں گے'' میں نے اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں جھانکا ''ڈی کنسٹرکشن کی کوکھ میں کنسٹرکشن ہوتا ہے، جسے وہ تلاش کرتے ہیں'' اس نے پہلو بدلا۔

مجھے اس کی یہ حمایت بری لگی۔ فردوس کا کسی سے اس قسم کا تعلق نہیں تھا لیکن تعلق تو میرا بھی نہیں تھا کسی اور سے۔ پھر بھی عاشقی میں رقابت اور محبت کا جذبہ ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔انتہائے شوق کا کمال یہ بھی ہے کہ اس کے بطن میں ''حسد'' کا پودہ بنا تخم ریزی کے اگ آتا

ہے۔لیکن اس وقت دل کی زمین اتنی زرخیز نہیں تھی کہ کوئی کڑوا بیج بغیر دیکھ ریکھ کے اگ آئے۔ پہلی نظر کا کمال یہ تھا کہ کھڑکی کے قریب بیٹھی فردوس میرے دل و دماغ پر ایسی چھا گئی تھی کہ جب میں نے اس دھندلے عکس کو رنگوں کی زبان دی تو کینوس پر ایسی تصویر ابھر آئی جو حقیقت سے زیادہ خوبصورت تھی آرٹ کے معنی یہی ہیں کہ فنٹاسی حقیقت کا روپ لے لے اور حقیقت فنٹاسی کی صورت اختیار کر لے اس وقت کچھ ایسا ہی ہوا کہ جیسے سخت گرمی کے بعد ریگستان میں جب پہلی بارش ہوتی ہے تو مٹی کی سگندھ فضا میں اس طرح پھیل جاتی ہے کہ پتھر دل بھی ہرن کی طرح مست ہو جاتا ہے۔ وہ اس لمحہ خلا میں اس طرح قدم رکھ رہی تھی جیسے ہواؤں پر پرندے رقص کر رہے ہوں۔ اس موجود لمحے کائنات اس قدر پراسرار ہو گئی ہے کہ جو دکھائی دیتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا۔ فردوس میرے سامنے سو رہی ہے اور میں جاگ رہا ہوں۔ سونے سے پہلے اس نے کہا تھا باب سید سے تھوڑی دور آگے کم آباد علاقے تھے لیکن پھر بھی چاروں طرف زندگی پیر پسارے تھی ہر جگہ بیداری تھی، پیڑ پودے تھے، ہوا تھی، صاف و شفاف آسمان پر جھومتے بادل تھے اب تو ہر طرف انسانوں کا جم غفیر ہے لیکن قبرستان جیسی خاموشی ہر جانب ہے، پر تکلف اور تصنع آمیز زندگی ہے ٹیں ٹیں، پوں پوں کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اونچی اونچی عمارتیں گونگی اور بہری ہو گئی ہیں۔ گولی چلے کان پڑی آواز سنائی نہ دے اور قتل ہو جائے۔ یہ بیچارے تہذیب یافتہ لوگ نہ گالی دیتے ہیں۔ نہ لڑتے ہیں۔ خاموشی کا سانپ ان کے سر پر سوار ہے۔ یہ بے حس بازارِ اساس کی پوش کالونی جہاں جذبات کا لین دین تول سے ہوتا ہے۔ علم سے بھرا تنگ ذہن دوسروں کی نجی زندگی اور تنہائی اور آزادی میں مخل نہیں ہوتا، مانو سب دماغ سے ہوتا ہے۔

کل میں تمہارے پرانے شہر اپنی پھوپھی سے ملنے گئی تھی۔ کچھ نہیں بدلا۔ وہی تکلف اور بناوٹ سے عاری زندگی، بدتمیز لوگوں کی زندہ بستی، چلتے پھرتے، چیختے چلاتے بھوکے لوگ جو ایک دوسرے کا غم مفت میں بانٹتے ہیں۔ بے علم، بے دماغ، منھ پھٹ نہ

رونے میں تکلف نہ ہنسنے پر پابندی۔ ہر آنے جانے پر نظر، ایسی نظر جو جدید طرز کا لباس پھاڑ کر چھپے اعضاء کی بھی پیمائش کر لے۔ گفتار گالی گلوج جیسی، نگاہ گدھوں جیسی قوت شامہ کتوں جیسی چاروں طرف کتے بھونکنے کی آوازیں، کبوتروں کی غٹرغوں، بلی کی میاؤں میاؤں سے سونے والے جاگ جائیں، یہ سب دل سے ہوتا ہے۔ میرا دل بے چین ہو گیا ہے۔ فردوس سو رہی ہے میری آنکھیں جاگ رہی ہیں۔ سونے سے پہلے اس نے کہا تھا کافی عرصہ کے بعد اپنے ملک میں گہری نیند سوئی ہوں ورنہ خوف اور خدشات نے آنکھوں کی نیند چھین لی تھی۔ کراچی حادثاتی شہر ہے صبح کا نکلا شام کو حفاظت سے لوٹ آئے تو غنیمت جانیے۔

''پاکستان بھی عجیب وغریب ملک ہے جس کی بنیاد مذہب پر ٹکی ہے'' میں نے کہا

''ہندوستان بھی عجیب وغریب ہو گیا ہے جبکہ اس کی اساس سیکولیرزم ہے'' اس نے کہا۔

''دراصل فساد اور دہشت گردی مذہب سے جڑی ہے''

''یہ سب قصور دانشوری کے زعم میں کیے گئے غلط فیصلے کا ہے''

''اسی لیے مقتدر اعلیٰ کی زمین پر زمین کے لیے فساد ہوا''

''ہاں وہ سلسلہ دہشت گردی کی شکل میں آج بھی دراز.....''

''دہشت گردی ملک کے آئین کی خلاف ورزی ہے''

''وہ چاہے زبانی ہو یا عملی، دہشت پسندی ہے''

''فسادات خود دہشت گردی کے ہم معنی ہیں کیونکہ اس میں معاشی اور معاشرتی دونوں ہی نقصان ہوتے ہیں''

''سلطان بننے کی کوشش میں یہ انسان نہیں رہتے'' اس نے کہا

''سلطان ہونے کے لیے پہلے انسان بننا ضروری ہے'' میں نے کہا

خاموشی کی کالی چادر میں رات آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے دیوالی ہو چکی ہے گلابی سردی نے اپنے پر پھیلا دیئے ہیں۔ فردوس کی مسہری کھڑکی کے قریب ہے خنک ہوا کے سبک جھونکوں پر اس کے گیسو محو رقص ہیں۔ میں نے چہرے سے بکھرے بالوں کو ہٹایا اور اپنے ہونٹوں کو جیسے ہی پیشانی پر رکھنے کی کوشش کی اس کی آنکھ کھل گئی وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے گداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹنا چاہا وہ مسہری سے فرش پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھ گئی۔ خوف اور خفگی کے ملے جلے احساس کے باوجود بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے کہا ''سرحدیں صرف ملکوں کی نہیں ہوتیں..... ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی اچھی لگتی ہے۔ میں ثروت کی عزت کی امانت دار ہوں''

میں بت بنا، ہونٹوں پر جبریہ مسکراہٹ کے ساتھ گونگے بہرے کی طرح اسے تکے جا رہا تھا۔

ooo

پیشین گوئی

مجھے یاد ہے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور ستارے میرے جسم میں چیونٹیاں بن کر داخل ہو گئے تھے اور وہ چیونٹیاں میری رگوں میں رینگ رہی تھیں۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ رونگٹے کسی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک نا معلوم جذبہ کے اثر سے کھڑے ہو گئے تھے اور قابوس بستر پر سو رہا تھا۔۔نہیں۔۔۔نہیں جاگ رہا تھا۔ کہ میں اس کی حفاظت کروں لطف کی بات یہ ہے کہ اس کا مقام ''خدا'' کا تھا۔ پھر بھی اسے یہ ڈر تھا ''غلام گروہ میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو اس کی سلطنت پر طوفان بن کر چھا جائے گا''۔ یہ پیشین گوئی ایک نجومی نے کی تھی اور اس نے یہ کہا تھا ''اس ماہ فلاں تاریخ میں جمعہ کی شب فلاں ساعت میں اس کا جنم ہوگا''۔ قابوس اپنے نرم بستر پر سو رہا تھا۔۔شاید جاگ رہا تھا۔۔نہیں۔۔نہیں۔۔۔نہیں بے چین تھا اور میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا یہ کیسا خدا ہے جس کی جان کی حفاظت میں کرتا ہوں؟ سونے اور جاگنے میں اس کی زندگی میری مٹھی میں ہوتی ہے۔ پھر تو خدا میں ہوا۔ اچانک جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اس کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا یہ بے معنی سا جذبہ کس قدر قوی ہے جو میرے اوپر سوار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے پھر میں خدا کیوں کر ہو گیا! سنا ہے خدا کے اوپر کوئی دوسری قوت نہ تو حاوی ہوتی ہے اور نہ ہی قابض۔۔۔ا۔۔و۔۔ر۔۔اور میں ایک نا معلوم خواہش کا غلام۔۔اچانک قابوس کے کروٹ لینے سے وہ چونک گیا اسے اپنے فرض کا احساس ہوا اور بلّم لے کر سیدھا

کھڑا ہو گیا۔۔قابوس سو رہا تھا۔۔نہیں۔۔نہیں بے چین تھا۔ بے چین تو وہ اسی روز ہو گیا تھا جب کہ منجم نے پیشین گوئی کی تھی۔ قابوس نے حکم دیا ''قطرے کے وجود میں آنے سے پہلے اس کی تقدیر میں فنا لکھ دو۔۔اور عورت اور مرد کے جسمانی تعلق کے درمیان حکم تھا کہ کسی قطرے کے تخلیقی وجود میں آنے سے پہلے اس کو مٹا دو تا کہ وہ زندگی کا منہ نہ دیکھ سکے'' اور ایسا ہی ہوا۔۔سارے ملک میں خیمے گاڑ دیے گئے۔ لوگوں کو اس کے حکم پر عمل کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ باپ کو حقِ پدری سے محروم کیا گیا۔۔۔ ماؤں کو لذّت مادری سے ترسایا گیا۔ اسقاطِ حمل کی خبریں تیزی سے گشت کرنے لگیں۔ محافظانِ قوم نے اس کار یہ کو سپھل بنانے کے لئے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنے اپنے حصہ کا کوٹا پورا کر کے انعامات لئے۔ نہ جانے کتنے معصوم زندگی سے محروم ہو گئے۔ عورت اور مرد صحبت کے لطف سے محروم ہو گئے۔ اس نے آسمان کو دیکھا، ستارے معمول کے مطابق چمک رہے تھے۔ جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارے گروہ میں ہی وہ شخص پیدا ہو گا۔ ایک تو ہم بمقابلہ قومِ قبطی جس کی نسل میں سے خود قابوس ہے تعداد میں کم ہیں اور دوسرے قابوس نے ہماری پوری ایک نسل کو قتل کر دیا۔ ممکن ہے اس شخص کے پیدا ہونے کے خوف سے یا اس لیے کہ غلام گروہ کہیں تعداد میں قبطی قوم کے برابر نہ ہو جائے۔ وہ سوچتا ہے اگر وہ شخص پیدا ہو گیا تو وہ تنِ تنہا قابوس اور اس کی سلطنت کے لیے بھاری ہو گا۔ وہ مسکرا اٹھا۔ اس کی نظر قابوس پر گئی جو خرّاٹے لے رہا تھا۔ وہ سوچتا ہے یہ سالا تو سو رہا ہے۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور ہاتھ اوپر اٹھائے'' اے بادشاہوں کے بادشاہ بھیج تو اس روح کو اس زمین پر جو میرے قوم کو قابوس کے ظلم سے نجات دلائے، میری مختصر سی قوم کو جو اس کے ظلم و ستم کے سبب اور بھی مختصر ہو گئی ہے۔ کب تک میری قوم تباہ و برباد رہے گی اور قابوس کا شکار رہے گی؟ اے خدا ہم لوگ شکار ہیں جو قابوس کے جال میں اپنی مرضی سے پھنستے ہیں۔ ہماری فریاد قابوس کے کانوں تک نہیں پہونچتی اے خدا ہم قابوس کی طرح خدا نہیں بننا چاہتے ہیں۔ ہمیں انسانوں جیسا بنا دے۔ ہمیں تو اس

ذلّت سے نجات دلا۔تو بھیج اس روشنی کو جو ہمارے درمیان کے اندھیرے کو کاٹ دے اور ہم قابوس کو سمجھ سکیں اس کے فریبوں کو پہچان سکیں"

"کون ہے؟" قابوس چونک کر بولا۔

"کوئی نہیں سرکار" اس نے بھی چونکتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ تم۔۔"

"ہاں سرکار"

"اچھا اچھا۔ہم رفع حاجت کریں گے۔"

چند لمحے بعد بستر خالی ہو گیا اور اس کی بیوی اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، رگوں میں چیونٹیاں رینگنے نے ایک دوسرے کو باہوں میں سمینٹ لیا۔دونوں کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں اور جب کھللیں تو وہ قابوس کے بستر پر بے حس وحرکت برہنہ پڑے ہوئے تھے۔دونوں نے خوف زدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔اس کی بیوی نے کپڑے درست کیے اور خاموشی سے خواب گاہ سے نکل گئی۔اور وہ بلّم لے کر دروازہ پر تعینات ہو گیا۔

قابوس آیا۔۔اور بستر پر دراز ہو گیا

اس حادثہ کے بعد مجھے میری بیوی نے بتایا "قطرہ نے وجود میں تبدیل ہونے تک فاصلے طے کر لیا ہے" میں یہ خبر سن کر سہم گیا۔سوچنے لگا قابوس کی بہیمانہ ظلم سے میں کیسے بچوں گا؟ اور وہ وجود جو میرے وجود کا ایک حصہ ہے اور میری بیوی کے رحم میں روشن ہے تو میں اس روشنی کو کیسے چھپاؤں گا؟ کیسے اپنی حفاظت کروں گا؟ کیا کروں گا؟ اے خدا مجھے راستہ دکھا کہ مجھے دکھائی نہیں دیتا حالانکہ میری آنکھیں ہیں اور تو خدا تجھے سب کچھ دکھائی دیتا ہے جبکہ تیرے آنکھیں نہیں ہیں" اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کو چاروں طرف اندھیرا سا دکھائی دیا اور جب اس نے اپنی آنکھوں سے ہاتھوں کا پردہ اٹھایا تو ایک بجلی سلی اس کے ذہن کے آسمان

پرکوندی اور کالے کالے بادلوں مین روشنی دکھائی دی، ہوا کے دوش پر رم جھم رم جھم بارش کی بوندیں ناچتی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ لیلا جو اس کی بیوی کے شکم میں پل رہی تھی، مرلی بجاتی ہوئی سنائی دی اس کی گونج میں وہ مست ہو گیا۔ اور جھوم گیا اس نے اپنی بیوی کو ملک کے قانون سے دور ایک پوشیدہ مقام پر بھیج دیا اور آخر کار وہ مہ، ماہِ کامل بن کر نمودار ہوا۔ منجم نے قابوس کو اطلاع دی ''حضور سورج سوا نیزے پر اتر آیا ہے۔ اب ہمارے سروں کی خیر نہیں''

قابوس آگ بگولہ ہو گیا۔ قریب رکھے شمع دان پر اس نے اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ چکنا چور ہو گیا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا'' آج کی شب تولد ہونے والی اولادِ نرینہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے'' قابوس نے سخت آواز میں حکم دیا۔ سارے ملک میں نفسی نفسی کا عالم طاری ہو گیا، لوگ سر پر ہاتھ رکھے اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے سورج سوا نیزے پر اتر آیا ہو اور زمین آگ کا گولا ہو گئی ہو۔

وقت گزر گیا۔ قابوس کا دماغ ٹھنڈا ہو گیا۔ سورج اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔ زمین ٹھنڈی ہو گئی۔ ایک روز قابوس اپنی اہلیہ کے ساتھ دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ موسم خوشگوار تھا ۔ خشک ہواؤں کے جھونکوں پر اس کی بیوی کے بال رقص کر رہے تھے۔ اور کبھی کبھی اس کے خوبصورت رخسار کو مس کر جاتے۔

''یہ گیسو مجھ سے رقابت نبھا رہے ہیں'' اس نے انگلی سے ان کو ہٹاتے ہوئے اپنے ہونٹ اس کے رخسار پر رکھ دیے۔ اس کی بیوی اس کی باہوں میں جھول گئی۔ اس کے قریب ایک حسین و جمیل بچہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے چہرے پر فرشتوں جیسی پاکیزگی تھی۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسوں بہہ رہے تھے۔ اس کی بیوی اس لڑکے کی آنکھوں اور حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی۔ اس نے مترحم نگاہوں سے اس بچہ کو دیکھا'' کون ہے یہ بچہ، کس کا ہے یہ؟''

قابوس کی آنکھ پھڑکی، لیکن بیوی کی ضد کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی'' دیکھو جی ہمارے پاس کوئی اولاد نہیں، آپ کے بعد کون اس ملک و مال کا مالک ہوگا۔ اس عظیم

الشان سلطنت کے لیے ایک ولی عہد کی بھی ضرورت ہے''

قابوس خوشی سے جھوم اٹھا اور اس نے اس بچے کا نام قینان رکھا اس کی پرورش بڑی شان وشوکت کے ساتھ ہوئی ناز ونعم سے اس کو پالا گیا۔ جنگ وجدل کے تمام فنون شہہ سواری، شاہانہ طور طریقے اس کو سکھائے گئے۔ آخر کار وہ پودا پروان چڑھا اور تناور درخت بن گیا۔ اس درخت کے سائے میں بھٹکے ہوئے مسافر پناہ تلاش کرنے لگے۔ ان پناہ گزینوں کو قینان نے اپنا پہلا درس دیا ''لوگوں! تمہارا اتحاد قابوس کے لیے طوفان ہوگا اور تمہاری نیکی تمہاری طاقت ہوگی''

یہ پیغام قابوس کے کانوں میں زہر بن کر داخل ہوا تو اس کو ایک نامعلوم خوف کا احساس ہوا اس نے اس احساس کو دباتے ہوئے کہا ''غلام گروہ کے درمیان پھوٹ ڈال دو، یہی ہماری فلاح کا راستہ ہے''

''حضور گستاخی معاف ہو... یہ حکومت کرنے کا کون سا طریقہ ہے''؟ ایک درباری نے پوچھا!

''ہاں یہ طریقہ ہمارے بزرگ حاکموں سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے...وہ تو چلے گئے لیکن ہمیں....

''لیکن حضور اب غلام گروہ میں یہ چال کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ قینان کا اثر لوگوں کے دلوں پر چھا گیا ہے''

''تو قبطی قوم کو کھلا چھوڑ دو کہ وہ غلام گروہ پر موت بن کر چھا جائے....اور ملک کے محافظوں سے کہو کہ وہ انہیں اس قدر ماریں کہ غلام گروہ کے آنسو نکل پڑیں۔ اور راعیانِ حکومت سے کہو کہ وہ بعد میں ان آنسوؤں کو اس طرح پونچھیں کہ ان کی خود کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہوں''

اور پھر ایسا ہی ہوا جیسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ لوگوں نے قینان سے مدد چاہی مگر

وہ مجبور تھا اس کے پاس سوائے آنسوؤں کے کچھ نہیں تھا۔

''ہمیں ان آنسوؤں کا کیا کرنا ہے'' ایک بوڑھے نے جھنجھلا کر کہا

''میرے نسلی بھائیوں! قینان اور قابوس کے آنسوؤں میں فرق محسوس کرو'' قینان نے روتے ہوئے کہا۔

لوگوں میں سکوت سا طاری ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

قینان نے لوگوں کو خطاب کیا ''ہم مجبور ہیں اور مجبور اس لیے ہیں کہ راعیانِ قوم اور محافظانِ ملک میں غلام گروہ کا کوئی شخص بھی داخل نہیں۔ آؤ ہم اس امر پر غور کریں۔

قابوس، قینان کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے ڈرنے لگا تھا اس نے حکم جاری کیا۔ ''راعیانِ قوم اور محافظانِ ملک میں غلام گروہ کے لوگوں کو شامل کر لیا جائے۔ راعیانِ قوم کے لیے فوراً عمل درآمد ہونا چاہیے لیکن محافظانِ ملک میں شامل کرنے کے لیے اسے محض حکم سمجھا جائے''

غلام گروہ کے جو لوگ راعیانِ قوم میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کو قابوس نے بلایا'' ہم نے تمہیں منصب دیا۔ اس کے عیوض تمہارے آنسوؤں کو خرید لیا ہے اب تم غلام گروہ کے افراد نہیں بلکہ راعیانِ حکومت کے اعضاء ہو تمہیں صرف اپنے منصب ہماری منشاء اور ہماری زندگی کی حفاظت کرنی ہے''

تمام لوگوں نے حلف اٹھایا اور وہی کرنے لگے جو قابوس چاہتا تھا۔ قابوس نے غلام گروہ کے نام ایک اعلان جاری کیا'' اے غلام گروہ کے لوگو! ہم نے وہی کیا جو تم نے چاہا حالانکہ تمہاری نسل کے بزرگوں سے ہم نے تم کو خریدا تھا۔ مگر پھر بھی ہم نے تم کو راعیانِ قوم میں شامل کر کے برابری کا حق دیا اس کے صلے میں ہم یہ چاہیں گے کہ تم کسی کے بہکاوے میں نہ آؤ بلکہ ہمیں تسلیم کرو''

یہ اعلان آگ کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ ہر شخص قابوس کے گن گانے لگا اور قینان سے قطع تعلق کرنے لگے۔ قینان یہ دیکھ کر افسردہ ہو گیا۔ مگر مایوس نہیں ہوا... اس نے اپنی تمام قوتوں کا مجتمع کیا۔ اور سوچنے لگا میری قوم کے لوگ بڑے معصوم ہیں۔ جاہل ہیں۔ اس لیے انہیں روشنی کی ضرورت ہے۔ اس نے جگہ جگہ شمع روشن کی

''اے لوگوں میں تمہاری فلاح چاہتا ہوں، میں تمہاری عزت کے لیے مرتا ہوں۔ تم لوگ علم حاصل کرو کہ انسان اور حیوان کا فرق کر سکو''

قابوس گھبرا گیا۔ اس نے راعیانِ قوم کی مجلس بلائی اور کہا ''اے غلام گروہ کے لوگو تمہاری قوم بڑی احسان فراموش ہے۔ تم لوگ اگر اپنے منصب کی خیر چاہتے ہو تو اپنی قوم کی تہذیب اور معاشرت کو کچل دو۔ یہ تمہاری وفاداری کا امتحان ہے''

''اے قابوس تو مجھ کو خرید نہیں سکتا۔ میری زبان تیرے پاس گروی نہیں ہے'' قینان نے کہا

قابوس غصّے سے سرخ ہو گیا۔ مگر اس نے غصہ کو قابو میں کرتے ہوئے کہا ''تم چاہتے کیا ہو، میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''

''مجھے تجھ سے کوئی بیر نہیں۔ میں تجھے روشنی دکھانے آیا ہوں، میرا وجود تیرے ظلم وستم پر چھا جائے گا''

یہ سن کر قابو گھبرا گیا ''لیکن میں تمہارا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دوں گا ''اس نے چیختے ہوئے کہا۔ ج

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا کہ وقت بہت بڑا منصف ہے''

''چلے جاؤ'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔

''آیا کون تھا؟ یہ کہتے ہوئے قینان واپس لوٹ گیا''

اس رات قابوس سو نہ سکا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے نرم

اور گداز بستر پر بہت بے چین تھا۔ ایک پل اس کی آنکھ نہ جھپکی۔ جب بھی وہ اپنی آنکھیں بند کرتا اس کو ڈراؤنے خواب وخیال نظر آتے اس کو محسوس ہوتا کہ قینان اس کے سر پر تلوار لئے کھڑا ہے اور وہ بے بس پرندہ کی طرح اس کے سامنے پڑا ہوا ہے۔ اور غلام گروہ تالیاں بجا رہا ہے۔ اس نے سوچا صبح ہوتے ہی راعیانِ قوم کا اجلاس بلائے گا۔ مگر رات تھی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا آسمان پر چمکتے ستارے اس کو سینکڑوں افعی کی آنکھیں معلوم ہوئیں جو اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ ڈر کر واپس اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے کاندھے بھاری ہو گئے تھے اس کو لگا کوئی ہے مگر وہ شکل اس کا گلا گھونٹ رہی ہے۔

صبح ہوئی، قابوس نے راعیانِ قوم کا اجلاس بلایا اور قانون پاس ہوا'' قاتل کو بھی سزائے موت اور قتل کے لئے اکسانے والے کو بھی موت کی سزا دی جائے گی''

''لیکن حضور ایسا قانون بنانے سے فائدہ'' ایک راعی نے دریافت کیا

''تم نہیں جانتے قینان کی طاقت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے مجھے خوف ہے کہ وہ اگر مجھے مارنے میں کامیاب نہ ہوا تو کہیں دوسرے سے قتل نہ کروا دے''

تمام راعیانِ قوم نے قابوس کی عقل کی داد دی۔ قابوس مسکرا دیا۔ وہ سوچنے لگا اب مجھے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ ''میں منجم کی پیشین گوئی کو جھوٹا ثابت کر دوں گا۔ میں تقدیر کی لکیروں کو مٹا دوں گا'' اس نے چیختے ہوئے کہا'' قینان کے حامیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے'' اس نے محافظانِ قوم کو حکم دیا۔

''حضور محافظانِ ملک قاتل بن جائیں، یہ کہاں کا انصاف ہے''؟ غلام گروہ کے راعیان نے زیرِ لب اعتراض کیا۔

''ہمارا انصاف یہ ہے کہ تم سب میری حفاظت کرو'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔

مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ اور ملک میں افراتفری پھیل گئی۔ محافظانِ ملک کے مظالم کا لوگ نشانہ بنے۔ مگر اس بار غلام گروہ سامنے آ گیا۔ اور مقابلے پر اتر آیا اس نے ظلم

کے منھ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ قابوس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایوانِ حکومت کے پائے لرزتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ قینان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ڈرنے لگا۔ منجم نے پیشین گوئی کی تھی "غلام گروہ میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو اس سلطنت پر طوفان بن کر چھا جائے گا" اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ قینان کی آواز اس کا تعاقب کر رہی ہے "میرا وجود تیرے ظلم وستم پر چھا جائے گا... نہیں نہیں"

"لوگو! اب عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ انقلاب کے لیے تیار ہو جاؤ۔ قابوس کا پایۂ تخت لرزنے لگا ہے۔ قینان نے اعلان کیا۔ تمام مجمع نے "انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا۔ محل کے درو دیوار ہلنے لگے۔ قابوس ڈر گیا خوف کے بادل منڈلا رہے تھے۔

"اب ایوان حکومت کو گرانے کے لیے کمر کس لو" قینان نے بلند آواز میں کہا۔ انقلاب زندہ باد کا فلک شگاف نعرہ فضا میں گونجنے لگا۔ قینان کی رہنمائی میں پورا مجمع آگے بڑھنے لگا۔ اب اس جم غفیر نے طوفان کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ آناً فاناً وہ طوفان قابوس کے محل میں داخل ہو گیا۔

قابوس گرفتار کر لیا گیا۔ قینان تخت نشین ہوا۔ قینان کی عدالت میں قابوس کے خلاف مقدمہ چلا۔

منصف نے فیصلہ دیا "اس میں کوئی شک نہیں کہ قابوس نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ لیکن اس نے ہمیشہ لوگوں کو قتل کرنے کے لیے اکسایا ہے۔ اس لیے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔"

"قابوس! جس قانون کو تو اپنا محافظ سمجھتا تھا۔ وہی تیرا قاتل ہے" قینان نے کہا۔

وقت کا دیوتا کہہ رہا تھا کہ جب جب کنش پیدا ہوں گے ان کے ادھار کے لیے کرشن آتے رہیں گے۔

ooo

صدیوں پر پھیلی کہانی

سورج نے اپنا جال بچھا دیا تھا، کائنات نے گرم سنہری لباس پہن لیا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان پانی بہہ رہا تھا۔ اس کی روانی بڑی تیز تھی۔

''تمہاری کہانی کا ہر لفظ اور ایک ایک حرف میری کہانی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ مماثلت شاید اس لیے ہے کہ کرّہ کے درمیانی نقطہ میں سمتوں کے فرق سے قطع نظر، فاصلہ دائرے کے نقطۂ مرکز اور نصف قطر کے درمیان جیسا بالکل برابر ہوتا ہے۔ اور وہ نقطۂ مرکز'' کلائمکس'' ہے۔ ''نقطۂ آخر'' ہے... اور یہی حسنِ اتفاق سے ''نقطۂ آغاز'' بھی ہے۔

تم نے ابھی کہا نا ''اسے میرے پسینہ سے پیار تھا... اسے میرے دماغ سے پیار تھا... اور میری روح سے پیار تھا... یعنی ابدی پیار... اسی لیے اس پیار کو بقا تھی... اور تم نے اس کے عیوض اس کو سر سے پیر تک چاٹا، کتنی مٹھاس تھی جسم کے ان کانٹوں میں جبکہ وہ اُگ آتے تھے میری قربت کے احساس....''

لیکن اب تم کہتے ہو کہ ''میری زبان لہولہان ہوگئی ہے اور اس کا ذائقہ اس قدر نمکین ہوگیا ہے کہ شروع میں زہر لگا اور اب بڑا ہی سوندھا سوندھا لگتا ہے۔

جب تم نے انہیں پہلی بار نا قابلِ برداشت حالت میں دیکھا تھا تو وہ دونوں ایک دوسرے میں سمٹے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے میں اس قدر پیوست تھے کہ درمیان میں بال برابر نکاس نہیں تھا کہ ہوا بھی گزر سکے۔ انہوں نے اس حدِ امتیاز کو پار کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے عبوری دور میں بے حد اور بڑی بے چینی سے بے قرار تھے۔ شاید صرف اس

مقام پر عورت کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے بال ٹھوڑی پر اگ آئے ہیں اور کچھ ناک کے نیچے۔ اور کبھی کبھی بعض کہانیوں کا یہی نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے.... لیکن میری کہانی کلائمکس کے بعد ختم ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھ لو ہر کہانی لامتناہی سلسلہ ہے نہ ختم ہونے کا۔ بس کہے جاؤ۔ ہاں جبکہ تم نے یہ پوچھا کہ ''کون تھا وہ؟'' تو اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا ''میرا دوست تھا وہ۔ بالکل تمہاری طرح۔ تمہارا جیسا ہی پسینہ ہے... تمہاری جیسی روح ہے... اور جسم بھی تمہارا ہی جیسا ہے... دیکھو تمہیں آگ اگلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بھی ڈھونڈ لو... آخر کب تک... ایک ہی راستہ پر مسلسل چلا جائے ہم زندہ ہیں... متحرک ہیں''

شروع شروع میں یہ الفاظ گرم لوہے کی سوئیاں بن کر کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے... پھر لگا جیسے ان سوئیوں نے پردوں کو رفو کر دیا ہو۔

کہانی کی پہلی کڑی:

دیکھو تمہاری کہانی وہ ہے جو کلائمکس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور میری کہانی.... میری کہانی جواب کہانی ہے۔ پہلے حقیقت تھی اور سچ کو سچ کہنے کے لیے دلیل کے طور پر اس کی کہانی سناؤں گا....

ہاں تو قصہ یوں اس نے بیان کیا تھا کہ ''جب خدا کو اپنا جلوہ دیکھنا مقصود ہوا تو اس نے آسمان بنایا' زمین بنائی' سورج' چاند اور ستارے چمکائے زمین کو گلزار کیا۔ آسمان کے اس طرف ایک خوبصورت سی جنت بنائی جس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری کیں.... جنت میں میوے اور پھلوں کے درختوں کو اگایا... اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوزخ بنائی جس میں آگ ہی آگ ہے، کھانے کے لیے آگ کے چنے، پہننے کے لیے آگ کے کپڑے اور آگ ہی کی چپلیں... اس جنت میں حور و غلمان ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں کو حوریں اور نیک عورتوں کو غلمان ملیں گے... باوجود اس کے، افزائش نسل کا سلسلہ ختم ہو جائے گا... ہاں تو اس میں اس کی تخلیق ہوئی۔ فرشتوں نے اس کی عظمت کو سجدے کئے۔ فضائیں بڑی

ہی پُر لطف اور خوبصورت تھیں۔ لیکن اس حسین و جمیل منظر میں اس کی طبیعت نہ لگی وہ فکر مند رہنے لگا.....وہ سوچ میں محو ایک خوبصورت درخت کے نیچے بیٹھ گیا کہ شاید سکون ملے اس کو دیکھ کر خالق کائنات بھی پریشان ہو گیا۔ آخر اس کی بائیں پسلی سے ایک عورت پیدا کی...وہ پسلی ٹیڑھی تھی...اس طرح تنہائی کا علاج تو ہو گیا لیکن اس نے عورت کو چھونے کی غلطی کی۔ پھر کیا تھا؟ زمیں ہل گئی، آسمان کانپ گیا۔ خالق کا جلال جوش میں آ گیا...اور ان کو زمیں پر پھینک دیا گیا...اور وہ بیچارے ان حسین فضاؤں سے تا قیامت محروم کر دئے گئے۔ کون جانتا ہے کہ یہ سزا ہے یا ''حکمت ربانی'' ہے۔ ''چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا'' عورت کو سزا ملی کہ وہ زندگی بھر اولاد کا بوجھ ڈھوئے گی...اور مرد ان کو اپنا پسینہ پلائے گا اور خون کھلائے گا۔ پہلے جس جُرم کی پاداش میں انہیں زمین پر پھینکا گیا اب وہی جرم ان کے اوپر حلال کر دیا گیا اور اس طرح عورت اور مرد ایک دوسرے میں ضرب ہوئے...پھر یوں ہوا ہابیل اور قابیل کے ساتھ ایک عورت بھی پیدا ہوئی...بس پھر وہی روایت دہرائی گئی پہلے اس نے اس کو بہکایا۔ بعد میں ان کو لڑا دیا۔ ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ اور زمین میں دبا دیا۔ تا کہ وہی مٹی جو اس کے تخلیق کے وقت استعمال ہوئی تھی اسی مٹی میں مل کر ایک اکائی بن جائے....بہر حال پانی بہتا رہا اور اس کی ہر لہر میں سینکڑوں کہانیاں پوشیدہ ہوتی رہی ۔ جو وہ روانی کے ساتھ گنگناتا ہے۔ کبھی دھاڑیں مار مار کر ڈکراتا ہے''۔ اب تم کو میرے کہانی سن کر ذرا بھی شک نہ ہوگا۔ چونکہ میں تم کو وہ باتیں بتاؤں گا جو بتانے کی نہیں ہوں گی اور وہ باتیں میں کہوں گا جو کہنے کی ہیں۔

کہانی کی درمیانی کڑی:

ہاں ہو یوں۔۔

''تم بھی ایک مجرم ہو، اس لیے کہ تم نے اس اشتہار کو رک کر دیکھا تھا'' یہ بات قاضی نے کہی

''لیکن رُک کر دیکھنے سے، میں کیا مجرم ثابت ہو گیا''؟

''تم اس شہر کے پہلے آدمی ہو، جس نے تصویر کو رُک کر دیکھا۔ لگتا ہے تمہارا اس تصویر سے کوئی سلسلہ ضرور ہے''

''حضور، میں آپ کے تجربہ اور ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ اور چونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا، اس لیے میں کہے دیتا ہوں کہ میں اس عورت کو جانتا ہوں کیونکہ میرا اس سے تعلق تھا۔ اسی لیے اس کو میں نے قتل کیا ہے۔ لیکن قتل کرتے وقت میرے ذہن میں ایک نیک ارادہ تھا۔ نیکی کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ جس حالت میں مقتولہ میرے ساتھ فرار ہوئی تھی، اسی حالت میں مری بھی ہے۔ میں اس عورت کا قاتل ضرور ہوں لیکن اس کی عصمت کا قاتل نہیں ہوں۔ اب میں یہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ اس میں بڑا قصور کون سا ہے؟ دوسرے یہ جو مال و اسباب لے کر میرے ساتھ فرار ہوئی تھی اس کی بھی میں نے حفاظت کی ہے''

''یہ بات سچ ہے۔ یہ تصویر بھی بول رہی ہے'' قاضی نے کہا

تھوڑی دیر فضا میں سکوت طاری رہا۔ کائنات کی نبض سی رک گئی تھی

''ایک بات بتاؤ کہ آخر تم...'' خاموشی کی کرچیاں ہو گئیں

گفتگو کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے ''ہاں، سرکار وہی بات بتاؤں گا۔ اصل واقعہ یوں ہے۔ ایک دن میں اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ سلطان کو پیغام رسانی کر کے محل سے واپس ہو رہا تھا۔ بلند دروازہ عبور کر کے دائیں جانب مڑا، ابھی محل کی سڑک کو پار بھی نہیں کیا تھا کہ ایک کاغذ کا پرزہ چھت سے گرا۔

''دیکھئے وہ یہ ہے'' قاضی نے ہاتھ بڑھایا۔

خوبرو نوجوان سلام حسرت قبول ہو!

پہلی ہی نظر میں دل جیسی قیمتی شے ہار گئی۔ تمہارا یہ چوڑا چکلا سینہ، مضبوط باہیں، لمبی لمبی ٹانگیں، گھونگریالے بال۔ اس شدت سے پسند آئیں کہ میں نے تمہیں اپنا شریک

حیات منتخب کرلیا۔تم بعد از نصف شب محل کی پشت پر ملنا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی...
والسلام۔

قاضی اس تحریر کو پڑھ رہا تھا... میں سوچ رہا تھا کیا کرسی کے لیے کوئی قانون نہیں ہوتا؟ دوسروں کے نجی خطوط پڑھنا اگر قانونی جرم نہیں تو اخلاقی جرم ضرور ہے! لیکن جرم... پھر... جرم ہے... میں نے بھی ایک سنگین جرم کیا ہے... ایک نامحرم کو لیکر شہر سے دور چل دیا۔ رات کے آخری حصہ میں ہم لوگ ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔عورت کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔گھوڑا قریب ہی باندھ دیا۔زین زمین پر بچھائی اور عورت کو سلا دیا... نیند کی حالت میں چہرے سے نقاب اُلٹ گیا... مجھے لگا جیسے بجلی سی کوند گئی۔ایک لمحہ کے لیے میری آنکھیں چندھیا گئیں اور محسوس ہوا جیسے بجلی سی میرے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔میں نے جلتی مشعل اپنی ایک انگلی رکھ دی، بجلی کوندی، دوسری انگلی رکھ دی.... یہ عمل چند لمحے جاری رہا... جب تھوڑا سا سکون ہوا... ایک درخت کے قریب، عورت کی جانب سے پشت کر کے بیٹھ گیا، سینکڑوں پرندے میرے ذہن کے آسمان پر پھڑ پھڑانے لگے اچانک ایک پرندہ میرے ذہن کے آسمان سے نکل کر میرے کانوں کے قریب اڑنے لگا''... اس عورت سے میں شادی کروں گا... بچے ہوں گے .... ممکن ہے لڑکی ہو... وہ بھی کسی خوبرو نوجوان کیساتھ اسی طرح رات کی سیاہی میں ...نہیں ...نہیں یہ سلسلہ آگے جاری نہیں رہے گا''

اچانک دوسرا پرندہ کانوں پر پھڑ پھڑانے لگا'' جو عورت اپنے باپ کے دامن پر داغ لگا سکتی ہے... کس سے خون کا رشتہ ہے... اور میں جس سے ریشمین دھاگے سے بندھا ہوا رشتہ ہوگا''

اچانک تمام پرندے میرے ذہن سے نکل کر میرے چاروں طرف اڑنے لگے ...ان کی خوفناک آوازوں نے ماحول کو بھیانک بنا دیا تھا... رات کی سیاہی گہری ہو رہی تھی

آسمان پر لگے ستارے اسے دامن پر لگے داغ محسوس ہوئے...نہیں...نہیں۔

میں نے تلوار کھینچ لی اور اس عورت کو کتنے ہی حصّوں میں قتل کر دیا... حضور میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے نسل در نسل چلنے والا سلسلہ...

''ہاں نوجوان تم نے بالکل صحیح کیا، دراصل اس کی ماں بھی میرے ساتھ فرار ہوئی تھی...میں نے ایک جنگ میں اس کے باپ کو شکست دی تھی۔ وہ میری فتح پر فریفتہ ہوگئی تھی ...(کچھ دیر خاموشی کے بعد)...تم نے اچھا کیا...''

مقتولہ کے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جو کہ سلطان کی فوج کا سپہ سالار تھا۔

قاضی نے فیصلہ دیا ''خون کے بدلے خون کی سزا معاف کی جاتی ہے۔''

پانی معمول کے مطابق بہتا رہا۔ اس میں بڑی روانی تھی۔ تیز رفتاری تھی۔ سرخی تھی۔ جو نہ رکنے کا نام لیتا ہے۔۔۔نہ ہی ٹھہرنے کا۔۔اور نہ ہی پیچھے لوٹنے کا.....

ooo

بائیں پہلو کی پسلی

اس رنگ منچ پر ایک اور سانحہ رونما ہوا یہ پہلا ہے نہ آخری۔ میری تخلیق اس بے مانند بے مثل ربّا کی منشا ہے اگر میری مرضی شامل ہوتی تو جسدِ خاکی جو اشرف المخلوقات ہے کے بجائے میں زمین پر اُگا ہوا درخت خلق ہوتی جو میرے لئے باعثِ افتخار اس لئے ہوتا کہ انسان کی ضروریات زندگی میں مجھ ادنیٰ کی بھی حصہ داری ہو جاتی پھر نہ تو دنیاوی آزمائش ہوتی نہ حساب و کتاب کی گنجائش اور عقوبت میں میزان سے نجات حاصل ہوتی۔ میں آفس سے آنے کے بعد آسودہ حال تھکن اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گئی آنکھیں آہستہ آہستہ اپنے آپ بند ہونے لگیں لیکن نیند کی دیوی قید نہ ہو سکی۔۔ روشنی کی کشتی پر سوار خلا کے اس پار چاروں طرف پانی ہی پانی صرف پانی۔ ایک عجیب محیر العقول کائنات کا شاید آخری سرا عمودی سمت کی جانب۔

ایک غیبی ندا فضا میں گونجی ''اگر نہ پیدا کرتا اے حبیب برگزیدہ ہر آئینہ نہ پیدا کرتا میں آسمان و زمین اور ساری مخلوق''

درمیان میں بے پناہ سکوت، اتھاہ خاموشی۔ چاروں طرف ہُو کا سا عالم، فقط ہو۔ سلسلۂ وقت ٹوٹا ہوا۔ نہ صبح و شام، نہ شب و روز۔ چاروں طرف پانی ہی پانی۔

آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے قصہ یوں ہے کہ پانی مخلوق ہوا۔ پانی سے ہر ایک جاندار چیز۔ زمین بنائی، زمیں کے اوپر پہاڑ قائم ہوئے۔ زمین میں برکت رکھی اور رہنے والوں کے لئے غذائیں بھی اس پر مقرر کر دیں۔

آسمان کے وجود میں آنے سے پہلے سارا خلا دھوئیں کی طرح تھا۔ پھر آسمان اور زمین کے ملاپ سے دنیا بسائی گئی آسمان سے سورج کی شعاعیں آئیں، گرمی پڑی، ہوائیں اٹھیں، اُن سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھی، پھر پانی بن کر مینھ برسا، جس کی بدولت زمین سے طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوئیں۔

اسی درمیان..... ابوالبشر کو منتخب کھنکتی ہوئی مٹی سے بنایا گیا

میری تخلیق باعثِ سکون وقرار اس لئے ہوئی کہ عالمِ تنہائی میں کوئی ہم جنس ابوالبشر کا نہیں تھا۔ اور بے جفت بے حاجت ہی کی مرضی تھی کہ اُن کا جفت و ہمسر پیدا کرے جب وہ بے قرار اور بے سکون ہوئے، عالمِ تنہائی سے خوف زدہ ہوئے تو ان کو خواب میں ڈالا گیا وہ ایسے سوئے کہ نہ نیند آئی نہ بیدار ہوئے اس صورت میں ایک ہڈی بائیں پہلو سے اس طرح نکلوائی کہ اس سے اس کو درد و الم نہ پہنچا اگر پہنچتا محبت عورتوں کی دلِ مردوں کے نہ ہوتی خیر ہوئی یہ دردِ تخلیق میرے سر جاتا..... اس ہڈی سے مجھے بنایا۔ مجھکو بنایا نیک روئی وملاحت اور حسن و جمال۔ اس کو بخشیں زیر کی و شرم اور شفقت و کمال۔

میری خوبصورتی پھر عالم تنہائی اوپر سے پابندئی حق ابوالبشر بے چین ہو گئے۔ ابھی غمِ طاق ختم نہیں ہوا تھا اب غمِ جفت کا روگ لگ گیا۔

روشنی کی کشتی لنگر انداز تھی میں بستر پر دراز، آنکھیں بند تھیں، نہ نیند نہ بیداری، نیند آنکھوں سے بہت دور..... میں خلاؤں سے بہت دور نکل چکی تھی..... پانی بھی دور دور تک نہیں تھا۔ چاروں طرف نا قابلِ بیان خوبصورتی کا منظر تھا۔ اس درخت پر نظر گئی کہ جڑ اس درخت کی چاندی کی اور ڈالیاں سونے کی پتّیاں زبرجد سبز کی تھی۔ نہایت خوش وضع اور خوبصورت.....

''سبحان اللہ کیا خوبصورت درخت ہے؟ حس جمال پھڑکی

میں نے تجھے بخشا اُس درخت کو مگر اس سے میوہ مت کھانا کیونکہ تو مہمان ہے میرے گھر کا'' غیب سے ندا آئی

''اس درخت کے پاس جا'' ایک آواز آئی

''صبر کر'' غیبی ندا

مجھ کج عقل کی مت ماری گئی لالچ اور خواہش میں آ گئی .....ایک عجیب تذبذب کا عالم تھا..... ہاں اور نا کی کشمکش تھی.....صبر اور خواہش کی اس جنگ میں صبر ہار گیا۔ شجرِ ممنوعہ کے کھانے کا انجام یہ ہوا کہ ستر کھُل گئے۔ الزام میرے سر گیا۔

آخر کار مجھے اور ابوالبشر کو اس اعلیٰ وارفع مقام جہان بھوک، پیاس، بے ستری، دھوپ نہ تھی سے دارالمعیصت ودارالعداوت میں امتحان کے لئے پھینک دیا گیا..... دوٗر ..... بہت دوٗر

'' آج بھی اُسی امتحان اور آزمائش سے گزر رہی ہوں'' وہ بڑبڑائی..... آنکھیں بند ہیں..... نیند کوسوں دور ہے..... نہ نیند ہے نہ عالمِ بیداری..... نہ چین ہے نا بے چینی..... آنکھیں پانی میں ڈوبی ہیں۔

دونوں بحالتِ ندامت وانفعال، گریہ وزاری میں مصروف ہو گئے۔ ایک تو بے گھری کا غم دوسرے جدائی کا الم۔ ایک دوسرے کو پانے کی جستجو میں برسوں بیت گئے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے کہ فاصلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ اگر فاصلہ مٹتا ہے تو طوفان کھڑا ہوتا ہے۔

چلتے چلتے فاصلہ ختم ہوا..... دونون ملے ایک دوسرے کی رودادِ غم سنی..... سلسلۂ زندگی آگے بڑھا۔ جب میں بحسن و جمال بصورت اقلیما خلق ہوئی تو قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا پہلا قتل روئے ارض پر رونما ہوا..... وجہ قتل میرا جمال ہوا، الزام میرے سر ہوا..... میں سوچتی ہوں اس میں میرا کیا قصور؟..... میرا ''غازہ'' کی طرح بے جمال ہونا بھی

میرے لئے وبال۔ میرا حسن و جمال شر کا استعارہ۔ میرا بے جمال ہونا باعثِ اذیت اور حقارت جبکہ نہ جمال میرا نہ بے جمال ہونے میں دخل میرا..... میری تخلیق، گناہ اور بہکاوے کی دلیل جبکہ یہ سب کرشمۂ کاتبِ تقدیر، کمالِ عزّ وجل۔

مجھ ابلا ناری کی کہانی بھی عجیب وغریب ہے۔ مخالف جنس کا ذکر ہی کیا۔ زیادتی کے عمل میں ہم جنسوں نے بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ نند بھابی، ساس بہو، دورانی جٹھانی، ماں بیٹی سب ایک دوسرے کے ساتھ پیکار میں مبتلا ہیں۔ چونکہ مرد، عورت کا عاشق ہوتا ہے اور جب عورت ناز وانداز کے ساتھ اپنے ہم جنسوں کے خلاف کان بھرتی ہے تو پھر ایک بڑا فساد رونما ہوتا ہے۔ آج صبح ہی میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔

''رحم مادر مین قتل کرنے کی خواہش ماؤں میں زیادہ دیکھی جارہی ہے۔ آج جدید دور میں رحم مادر میں اولاد کی جنس معلوم کرلی جاتی ہے۔ کلینک میں جنس معلوم کرنے کی اصل وجہ اسے ضائع کرنا ہے۔ لڑکیوں کی نادانی یا کسی زیادتی سے حاملہ ہو جانے پر بدنامی کے ڈر اور خاندانی وقار کی وجہ سے اسقاطِ حمل ضائع کروادیا جاتا تھا۔ اب جہیز اور کنیا دان کی وجہ سے رحم مادر میں قتل کا سبب ہے۔ لڑکیوں کو خرچ اور لڑکوں کو آمدنی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے تعلق سے عدمِ تحفظ کا احساس والدین میں بڑھ رہا ہے کیوں کہ روز افزوں جنسی جرائم میں اضافہ ہورہا ہے۔ ڈاکٹر اس وحشت ناک عمل کی محض اس لئے حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ اس سے انہیں زیادہ کمائی ہوتی ہے''

آنکھیں بند ہیں' نیند کوسوں دور ہے..... نہ نیند ہے نہ عالمِ بیداری..... وہ خبر کا تجزیہ کرنے لگتی ہے.....

: جدید دور میں تہذیبی انحطاط کا نام ''ماں'' ہے!

: ڈاکٹری زندگی کو موت کے مہنہ سے چھین نے کا پیشہ ہے لیکن ڈاکٹر موت کا

دوسرا نام ہے۔

:لیڈی کے اندر جب ماں، بیٹی، بہن جیسے پاکیزہ رشتہ مرتے ہیں تب ڈاکٹر پیدا ہوتی ہے۔

:خاندانی وقار کی خاطر بیٹی کا اسقاطِ حمل ضروری ہے لیکن بیٹے کا ناجائز جنسی عمل باعث افتخار ہوتا ہے۔

:جہیز اور کنیادان مرد کو ویشیہ کی طرح خریدنے کا ذریعہ ہے پھر بھی عورت غلام اور مرد مالک ومختار ہوتا ہے!

:روز افزوں جنسی جرائم میں اضافہ..... یہاں مرد بھول جاتا ہے کہ وہ عورت جو ماں ہے اسی کے گندے خون سے پیدا ہوا ہے!

خبر کے تجزیہ کے دوران اسے یاد آیا چند سال پہلے اسی زمین پر مجھے بصورت چترا چتا میں زندہ جلا کر دھرم ادھیکاریوں نے اپنی تہذیبی عظمت میں چار چاند لگائے تھے۔ میرا قصور یہ تھا کہ میرا پتی مر گیا جیسے میں اپنی مرضی سے بیوہ ہوگئی۔ میرے پتی کو جینے کی تمنا بہت زیادہ تھی..... میں سوچتی ہوں وہ بھگوان تھا تو پھر مرا کیوں؟..... میرا پتی مرا اور سزا بھی مجھے ہی ملی..... چلو اچھا ہوا پل پل جلنے سے ایک بار جل گئی قصہ ختم ہوا۔ لیکن معاملہ جیون پریم کا ہے۔ میں تو پتی کے پریم میں جل گئی..... کیا میرا پتی، میرا سوامی، میری چتا میں جلتا؟ نہیں نہیں پتی دیو..... نہیں..... نہیں میرا سوامی..... میں تو داسی ہوں ..... داسی بننا گوارہ..... لیکن دیوداسی!؟..... بچپن میں باپ کی ملکیت، جوانی میں شوہر کی ، بیوگی میں اولاد کی مملوکہ..... جبکہ آدھی زمین کی میں مالک اور آدھا آسمان میرا ہے پھر بھی میں کنگال!

آنکھیں بند ہیں۔ نیند کوسوں دور ہے۔ نہ عالم بیداری نہ عالم نیند۔ ذہن کے پٹ کھلے..... اڑن طشتری پر سوار تمام عالم کی سیر

مجھے بصورت پانڈورہ (Pandora) تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا۔ اور جب ایفروڈایٹ (Aphrodite) یعنی کام دیوی کا روپ اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا تو میری پرستش کا آغاز ہو گیا۔ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے تین مزید دیوتاؤں سے آشنائی کا چرچہ عام ہوا۔ میرے بطن سے کیوپڈ پیدا ہوا کہا جاتا ہے کہ وہ غیر قانونی دوست کی لگاوٹ کا نتیجہ ہے..... میں دیوی تھی..... میں دیوی ہوں۔

میں نے مذہبی پیشواؤں اور وقت کے حکمرانوں کے پیروں تلے اپنی ذلفیں بچھا کران کو عزت دی پھر بھی انہوں نے فلورانامی کھیل میں..... اپنی دیوی کو برسرِ عام برہنہ دوڑا کر رسوا کیا اور خود لطف اٹھا کر مجھے بدنام کیا۔ پتھر پڑ جائیں ان عقلوں پر میری (Mary) کو ایشور کا روپ دے کر عبادت کرتے ہیں اور اس کے بیٹے کو صلیب پر لٹکا کر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ یہ کیسی عزت ہے؟ کہ مجھے گناہ کی ماں۔ ایک ناگزیر جدائی ،ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت ،ایک خانگی خطرہ ،ایک غارت گر دلربائی..... ایک آراستہ مصیبت کہا گیا۔ میری پیدائش شرمندگی کا باعث۔ اپنی جہالت کو غیرت اور خودداری کے دبیز پردے سے ڈھانکتے ہوئے مجھے زندہ درگور کر کے فخر محسوس کیا گیا۔

''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی''

وہ خوف کے مارے پسینہ پسینہ ہو گئی اُسی لمحہ آنکھیں کھل گئیں اور اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ باہر بجلی تڑکی اسے لگا دور کہین پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا ہو، آسمان نے گہرا سیاہ رنگ کا کمبل اوڑھ لیا تھا چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا کمرا سیاہی میں ڈوب گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کوئلے کی چھت اور تاروں بھرے آسمان کا فرق محسوس کرنے لگیں کیونکہ آسمان اور چھت کا فرق مٹ گیا تھا۔

''شاید لایٹ چلی گئی''

اس نے موم بتّی جلائی .....اندھیرے میں ہلکی سی روشنی بھی راہ نمائی کرتی ہے۔ وہ باتھ روم میں داخل ہوئی اور نل کھول کر بیٹھ گئی.....اس کی تھکن مٹی کی طرح زائل ہونے لگی۔ اس نے نیلی جھیل چاندی کے بدن پہ لپیٹی اور آئینہ کے سامنے بیٹھ گئی جس میں اس کا عکسِ بدن دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا ہے۔ کنول جیسے چہرے پر پاؤڈر کی تہہ جمائی اور دونوں شعلوں پر غازہ لپیٹ کر اس کی دھک میں اضافہ کیا۔ اپنی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں جھانک کر خود شرما گئی اور اپنے آپ میں سمٹنا شروع کر دیا۔

اچانک لائٹ آ گئی چاروں طرف خوشبو میں ڈوبی ہوئی روشنی پھیل گئی۔ اس کے اوپر سحر سا طاری ہو گیا۔ بستر پر دراز ہو گئی ..... ہلکا ہلکا نیند کا خمار طاری ہونے لگا..... وہ خواب کی باہوں میں چلی گئی..... چہار جوانب دھواں دھواں.....اندھیرا ہی اندھیرا .....خواب، دھواں اندھیرا.....خوابوں کی کشتی پر سوار، چاند کے اس پار، اس کا سفر جاری ہو گیا گھپ اندھیرا جیسے بحرِ ظلمات نے اپنے پر پھیلا دئے ہوں..... پوری کائنات اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اچانک صبح صادق کی مانند ایک نور چمکا آسمان پر گیا اور زمین پر روشنی کی طرح پھیل گیا۔ سارا عالم بوئے مشک وعنبر وعود میں ڈوب گیا۔ عالم تجرّدی میں ہزاروں برس تسبیح وتہلیل میں مصروف رہا بعدہ اس نور نے عالمِ خلوت سے عالمِ صورت اختیار کی اور فرمایا ''میں پیدا ہوا ہوں نور کل سے اور میرے نور سے ساری مخلوق''

پوری کائنات بقعہ نور بن گئی ، چہار سمت انوار کی بارش ہونے لگی مشرق تا مغرب، شمال تا جنوب بس نور ہی نور از بس سارا عالم بحرِ نور میں ڈوب گیا ایک ابر کا ٹکڑا نورِ مجسّم پر سایہ بن گیا اور وہ نورِ مجسّم سارے عالم پر سایہ بن گیا۔ جب نورانی آنکھوں نے سارے عالم پر طائرانہ نظر ڈالی تو آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ ہر جانب افراتفری کا عالم تھا۔ ظلم وستم کی آندھی زوروں پر تھی.....زمین خاک وخون سے آلودہ ہو

رہی تھی.....آسمان سسک رہا تھا۔

میری بدحالی کی داستاں یہ تھی کہ میری پیدائش کی خبر سنتے ہی چہرے پر کلونس چھا جاتی شرم کا داغ لگنے سے میرا ہی خون منہہ چھپاتا پھرتا اور سوچتا ذلّت کے ساتھ رہے یا ذلّت کو مٹی میں دبا دے۔

اس نے فرمایا ''وہ گھر جنت جیسا خوبصورت ہے جسمیں لڑکیاں ہوتی ہیں اور لڑکیاں اس کے لئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی''

اس طرح ظلم و بربریت سے نجات دلا کر ہمیں عزت و وقعت دلائی۔ قانونِ فطرت کی روشنی میں مکمل ضابطۂ حیات ترتیب دیا اور کائنات میں غایت درجہ کا اعتدال و توازن کا اجالا بکھیر دیا۔ جس میں فطرتِ انسانی کے مخفی پہلو اس کی جسمانی ساخت، حیوانی جبلت اور انسانی سرشت کا پورا پورا دھیان رکھا۔

اچانک وہ خواب سے بیدار ہوئی چاروں طرف نظر دوڑائی کمرا روشنی اور خوشبو میں ڈوبا ہوا ہے، آنکھیں ایسی چکا چوند ہوئیں کہ ''بس ایک جھما کا روشنی کا لے گیا آنکھیں میری''.....یہ کیسی نئی روشنی ہے کہ دکھائی نہیں دیتا؟.....یہ کیسی بیداری ہے کہ نیند نہیں ٹوٹتی؟ .....گھڑی پر نظر گئی۔ ''ابھی آٹھ بجے ہیں''۔ وقت کبھی نہیں رُکتا.....لیکن شاید رفتار سست ہو گئی ہے..... بار بار تانگہ کی طرح پیچھے کو لوٹتا ہے۔ ٹیبل پر رکھے اخبار کی ایک سرخی پر اس کی نظر گئی ''عورت قید و بند، پابندی اور رکاوٹ سے آزاد'' کسی امریکن مصنفہ کا بیان

وہ سوچتی ہے لیکن حقیقی عورت کو کیا ملا؟ اگر ملا ہے تو مرد بن کر ملا، عورت کی حیثیت سے آج بھی ویسی ہی ذلیل ہے۔ عزت اگر ہے تو اس مردِ مؤنث یا زنِ مذکر کے لئے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت، مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو۔

''عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے، حالانکہ کوئی مرد زنانہ لباس پہن کر برسرِ عام آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا'' اچانک اس کے منہہ سے نکلا وہ زیرِ لب

مسکرائی دیوار کے کلینڈر پر بنی ہوئی تصویر پر اس کی نظر گئی مرد و عورت نیم برہنہ بوس و کنار میں مصروف نظر آئے۔

اسے خیال آیا فاطِر السمٰوٰتِ والارض نے جوڑے بنائے تا کہ ان کے پاس سکون حاصل کرو..... وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو''

وہ سوال کرتی ہے کیا یہ جسمانی ربط ہے، دل کا لگاؤ یا روحوں کے اتصال کا تعلق ہے''

مختلف سوالوں سے الجھتے ہوئے ..... وہ پلنگ سے اٹھی ..... کھڑکی کے پٹ کھولے، ہلکی سی ہوا کا سرد جھونکا اندر داخل ہوا..... باہر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا، سڑک موٹر گاڑیوں اور اسکوٹروں کے بے ہنگم شور میں ڈوبی ہوئی گاڑیاں کہاں جا رہی ہیں؟..... پتہ نہیں..... ایک سفر ہے بے منزل سفر..... کبھی اندھیرا، کبھی روشنی ..... اندھیرے کا سفر.....اندھیرے سے اندھیرے تک کا سفر..... ماں کے پیٹ سے زمین کے پیٹ تک اندھیرے کا سفر..... وہ ماں اور زمین کے فرق کو جاننے میں مصروف ہوگئی۔ جس طرح کھیت میں کسان کا کام محض بیج بونا ہی نہیں اس کو پانی دینا، کھاد مہیا کرنا، اس کی صیانت کرنا بھی ضروری ہے..... پھر کسان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انتظار کرے اس کی پیداوار کا..... یہ ذمہ داری ہے اس کی پرورش اور اس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے.....وہ کھڑکی سے آہستہ آہستہ پلنگ پر آ گئی.....اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی

معمول کے مطابق صبح کا اٹھنا..... سر پر شور اٹھائے سڑک پر دوڑنا..... کیو لگانا..... انتظار کرنا.....بس کا چلنا..... دھوئیں کا لباس پہننا..... آفس کی کٹ کٹ بوس کی ڈانٹ ایک کڑوے گھونٹ کی طرح پینا..... یہ غلامی ہے یا آزادی؟.....وہ سوچ نہیں پا رہی کیا اخبار کی خبر غلط ہے؟۔ میں کونسی صبح کی منتظر ہوں، پھر وہی اُکتا دینے والی زندگی کا مرکز..... دائرہ کا ایک نقطہ..... کیا میں قیدی ہوں؟..... حالانکہ فعل اور انفعال

دونوں ہی اس کارخانۂ حیات و کائنات کو چلانے کے لئے یکساں ضروری ہیں..... ایک شے تاثیر دوسری شے تاثر ہوتا ہے لیکن میری زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے..... روز تھکی ماندی آفس سے لوٹنا..... سر سے پاؤں تک تھکن دھونا..... انتظار کرنا وہ آئے گا..... اس کے ساتھ گھومنا..... کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھنا..... چائے پینا گھر لوٹنا ہر روز یہی معمول..... مجھے کس کا انتظار ہے؟..... یہ سلسلہ روزِ ازل سے آج بھی جاری ہے کہ فاصلہ ختم ہی نہیں ہوتا..... اگر فاصلہ مٹتا ہے تو پھر کوئی نیا طوفان کھڑا ہوتا ہے..... یہ انتظار ہے یا نارِ جہنم..... چاروں طرف آگ ہی آگ۔ اس میں نہ جلتا ہے نہ محفوظ رہتا ہے..... نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے..... آگ نہ ہوئی میرا مقدر ہوگئی..... پھر وہی قید..... حبسِ دوام کی سزا جو پانچ سال پہلے میں نے مختار کے ساتھ قبول کی تھی..... وہ مختار تھا..... میں مجبور..... وہ حاکم تھا اور میں محکوم..... وہ بھگوان تھا اور میں داسی..... وہ میری مرضی تھا۔ تعلیمی دور میں، آرزوئیں اور تمنائیں تھیں..... منزل پانے کی جستجو..... میرے جاگتے خوابوں میں وہ داخل ہوا اور میری زندگی پر چھا گیا۔

جب اجلی دھوپ نے اپنے پریسمنٹ لئے تو سورج کا قتل ہوا اور سرخ سرخ خون دورِ مغرب تک پھیل گیا..... مقتول سورج کا عکس بوند بوند جھیل میں ٹپک رہا تھا۔ میں اس کے ایک کنارے پر مختار کے گرم آغوش کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ اس وقت میرا اپنا وجود کچھ بھی نہ تھا ایک ایسا رقیق مادّہ جو جس برتن میں گرتا ہے ویسی ہی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا، چاروں طرف سبزہ اگا ہوا تھا، سرمئی اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا..... فضا پر مسرت تھی، خُنک ہوا سبک خرام تھی..... دوش پر میرے گیسو محوِ رقص تھے۔

''ایسا لگتا ہے شفق پر سرمئی چادر چھا رہی ہے'' مختار نے میرے چہرے پر پڑی ہوئی زلفیں ہٹاتے ہوئے کہا

''ہاں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے''

''محسوس میں بھی کر رہا ہوں..... چلو اس اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر لیں''

مختار نے اپنی باہوں کے دائرہ کو تنگ کیا۔

''کیسے؟''

''تمہیں قیدی بنا کر''

''مجھے بھی تنہائی سے رہائی مل جائے گی''

اور میں قید ہوگئی..... ہر روز کی طرح سورج کا نکلنا..... صبح کے معمولات سے فراغت حاصل کرنا..... آفس چلے جانا..... گھر واپس ہونا..... پھر اپنی اپنی تھکن کو چائے کے ساتھ نگلنا..... شام کا مختصر کھانا لینا..... تھوڑی دیر بازار میں چہل قدمی کرنا..... کبھی کبھی کوئی اچھی فلم کا دونوں کا ایک ساتھ دیکھنا..... میں نے نوکری کے ساتھ ساتھ ایک ہاؤس وائف کی تقریباً سب ہی ذمہ داریاں اوڑھ لی تھیں..... حالات اور مصروفیات میں، میری پوری حصہ داری تھی..... لیکن میں مختار کی حصہ داری ڈھونڈنے لگی۔ یہیں سے عورت کی زندگی میں انتشار شروع ہوتا ہے اور بگاڑ تک نوبت آجاتی ہے۔ کچھ دن کے بعد زندگی کے معمولات میں فرق پڑنے لگا جو میری امیدوں کے خلاف تھا..... زندگی سکڑ کر بہت مختصر ہوگئی تھی۔ نوکری کے بعد مجھے صرف گھر دیکھنا تھا اور مختار آزاد تھا، گھریلو زندگی سے اسے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اکثر اکیلے ٹہلنے نکل جانا، تھک ہار کر سو جانا چونکہ میں عورت ہوں اسی لئے میری پابندیاں زیادہ ہیں ایسا وہ سوچتا تھا۔ صدیوں کی مظلومی و محکومی نے عورت کے ذہن سے عزّت نفس کا احساس مٹا دیا تھا اور میں بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ میرا بھی کوئی حق ہے، عورت کا کوئی مقام بھی ہے۔ مجھے سب کچھ برداشت تھا لیکن دیر رات گئے گھر لوٹنا پسند نہیں تھا۔

''میں تمہارا انتظار کرتی رہتی ہوں، اور تم آوارہ گردی کرتے ہو''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب صاف ہے، تم اوب گئے ہو مجھ سے''

میں خاموش ہوگئی، کمرے میں سکوت طاری تھا..... وہ بھی بستر پر لیٹ گیا۔ بیڈشیٹ پر پڑی ہوئی لکیر جو ہم دونوں کے درمیان ابھر آئی تھی وہ اس وقت اور گہری ہوگئی جب میں نے بائیں جانب کروٹ لی اور اپنی آنکھیں بند کئے خاموشی سے لیٹ گئی..... کمرے کی کفن پوش دیواروں پر رات کی سیاہی گہری ہو رہی تھی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تمام آوازیں لاش کی طرح تابوت میں قید ہوگئی تھیں..... میں مسہری سے کمر لگا کر بیٹھ گئی..... دیوار پر ٹنگے کلینڈر پر نظر گئی..... جسم نے آشنا سی لذت محسوس کی، کبھی برف کی پرتیں اس کی انگلیوں کے گرم گرم لمس سے پگھلی تھی..... وہ رات بڑی حسین تھی، حسین رات رنگین بھی ہوتی ہے..... نرم بستر پر گلاب کی پنکھڑیاں بکھری تھیں، ماحول معطر تھا میں مختار کے آغوش میں سمٹ گئی تھی آنکھیں بے نام بے خودی کے عالم میں دور کہیں سفر میں نکل گئیں ..... چھوٹا سا کمرہ یاقوت اور زمرد کے بنے محل میں تبدیل ہوگیا..... بیلا۔ چمیلی اور گلاب کی مہک سے فضا معطر تھی..... پشت پر نہر گنگنا رہی تھی..... جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید تھا، شہد سے زیادہ میٹھا تھا..... پرندے آسماں پر چہچہا رہے تھے۔ ہوا نہ سرد تھی، نہ گرم ایک عجیب مستی بھرا ماحول تھا..... نہ مرنے کا غم تھا اور نہ جینے کی چنتا..... تمنا آرزو اور امیدوں سے لبریز کائنات تھی۔ خواب آور زندگی تھی۔ خوبصورت اجلی راتیں دن کی طرح روشن..... دن رنگین رات کی طرح حسین۔ خوشبو، رنگ اور پریم میں ڈوبا ہوا سارا عالم تھا۔ چند لمحوں کے لئے میں صدیوں کی غلامی بھول گئی تھی..... میں بھول گئی تھی کہ میں عورت ہوں صرف اتنا یاد رہ گیا تھا..... کہ میں معشوقہ ہوں..... ایک محبوبہ ہوں..... دل کی رانی ہوں جس پر میری حکمرانی ہے اور مرد میری سلطنت ہے اگر حکم کروں تو ستاروں سے میرا دامن بھر دے جب عورت ایسے بے مہار طوفان میں بہتی ہے تو یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ مرد ایک ٹھوس مادہ ہوتا ہے جس کی اپنی صورت اور اپنا ایک حجم ہوتا ہے جو ٹوٹ کر نا قابل تقسیم جُز بن کر ایٹم کی طرح

خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلو بدلا برابر میں مختار دنیا و مافیھا سے بے خبر سو رہا تھا..... جو میرے ایک ایک لمس کو چاٹتا تھا

''تم شاعری سے زیادہ حسین اور لذّت آفریں ہو''

''غزل پڑھنے لگے''

''غزل محبوب کی پیکر تراش ہوتی ہے۔ لیکن تم تصوراتی حقیقت ہو''

اس وقت ہم جھیل میں پیر لٹکائے بیٹھے تھے..... کائنات اپنے محور پر گھوم رہی تھی۔ آسمان کے گرد زمین چکر لگاتی ہے مگر لگتا ہے کہ آسمان گھوم رہا ہے۔ اچانک ہوا کے چلنے سے کھڑکی کے پٹ کھلے اور کلینڈر کھڑ کھڑانے لگا جیسے ساعتوں کی گنتی کر رہا ہے۔

''زندگی کے لئے ذہنی ملاپ کے ساتھ ساتھ جسمانی ہم آہنگی بھی ضروری ہے''

''تم مرد لوگ جسم کے آگے کچھ نہیں سوچ سکتے''

میں نے ذہنی ملاپ کو بنیادی شرط کہا ہے''

شاید یہی اختلاف رائے ہماری محبت کی بنیاد بنا تھا اور دوستی کا رشتہ رفتہ رفتہ محبت کے رشتہ سے ہم کنار ہونے لگا جہاں مرد اور عورت ایک دوسرے سے ضرب ہو کر ایک عدد بن جاتے ہیں.....

اچانک کلینڈر کھڑ کھڑانے لگا..... میں نے چونک کر دیکھا..... مختار گہری نیند میں سویا ہوا ہے۔ چین کی نیند وہی سوتے ہیں جو بے غم ہوتے ہیں.....

معمول کے مطابق صبح ہوتی..... مختار بیڈ ٹی کے درمیان اخبار پڑھتا..... ''عراق تباہ ہوا''، ''افغانستان برباد ہوا'' جب جب دنیا میں طاقت کا توازن بگڑے گا تباہی بربادی آئے گی..... ایک طاقت دوسری طاقت سے ڈرتی ہے اس کی عزت کرتی ہے توازن برقرار رہتا ہے۔

''میں محسوس کر رہی ہوں، ہم دونوں کے درمیان سے محبت زائل ہو رہی ہے''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو'' آنکھوں کے نیچے سے اخبار ہٹاتے ہوئے

''مجھے ایسا لگتا ہے''

''یہ تمہارا وہم ہے''

''اور آپ کیا سوچتے ہیں''؟

''دراصل جب ہم دونوں ایک دوسرے کو پانے کی جستجو میں تھے..... تو ملنے کے لئے ہر لمحہ بے چین رہتے تھے اور ان لمحوں کی ملاقات کو قیمتی بنانے کے لئے ہمیں انتظار کرنا پڑتا تھا..... میں اکثر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر ہر زاویہ سے اپنے بال سنوارتا، شیو بناتا، خوشبو لگاتا تھا۔ لیکن اب وہ نہ انتظار کی کیفیت ہے اور نا ہی وصل کی لذت!

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اکثر نو محبت کی شروعات کریں..... ملاقات کے سلسلے قائم کریں..... محبت کی باتیں کریں..... سیر و تفریح کریں..... ریسٹورنٹ جائیں.....

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو..... میں گھبرا گئی ہوں ان معمولات سے..... زندگی کتنی تنگ ہو گئی ہے۔ آفس اور گھر کے درمیان میں!..... ایسا لگتا ہے ازدواجی زندگی درمیان سے غائب ہو گئی ہے..... مرد پورے طور سے مکمل اور عورت ادھوری ہو گئی ہے..... یا بیچ میں کہیں مر گئی ہے''

ہم دونوں کے درمیان دراڑ پڑ گئی نہ ٹوٹنے والی۔ وہ اس وقت اور گہری ہو گئی کہ مختار راتوں کو غائب رہنے لگا..... دیر سے گھر لوٹنا اس کا معمول بن گیا..... میرے اعتراضات بے معنی ہو کر رہ گئے۔

ہر جوڑ کا آخری نتیجہ توڑ ہوتا ہے۔ ایک دن میں نے علیحدگی اختیار کر کے رہائی حاصل کر لی..... وہ لمحہ اس قدر قیمتی تھا کہ صدیوں کے قیدی پکھیرو کو فضا میں چھوڑ کر آزاد کر دیا گیا ہو۔

رات کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا..... اس اندھیرے پر خاموشی کا سانپ پھن

پھیلائے بیٹھا تھا..... وہ پلنگ پر سر پکڑے بیٹھی تھی..... باہر سڑک پر موٹر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں..... کبھی روشنی کبھی اندھیرا..... مجھے کس کا انتظار ہے؟..... کیوں انتظار ہے؟ پھر وہی..... رہائی اور قید کا سلسلہ..... ٹیبل پر رکھے اخبار کو اٹھالیا.....

''عرب بہاریہ'' جلی خبر..... لبنان میں انقلاب..... شام میں انقلاب کی دھمک..... اخبار کو اس نے ٹیبل پر رکھ دیا..... گھڑی پر نظر گئی دس بج رہے تھے، اس کے چہرے سے اکتاہٹ اور کراہیت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے..... اچانک کواڑ کی چُر..... چُر..... ر..... رسے وہ چونک گئی..... سامنے شاہین کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''معاف کرنا..... میں لیٹ ہوگیا'' شاہین نے شرمندگی کا احساس کیا

''اچھا ہوا، آپ لیٹ ہوگئے.....

''تمہیں انتظار گراں خاطر گزرا ہوگا..... لیکن اب نہیں گزرے گا'' اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

''میں بھی یہی چاہتی ہوں، اب نہ گزرے'' کڑوا گھونٹ نگلا

''حبسِ دوام کی سزا دینے کے لئے ابا راضی ہوگئے ہیں'' شاہین نے مسکراتے ہوئے باہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی

''یہ سزا کا سلسلہ کب تک چلے گا؟'' پیچھے ہٹتے ہوئے..... نہیں..... نہیں شاہین مجھے معاف کردو..... معاف..... اب مجھے کوئی سزا نہیں چاہئے..... مجھے..... مجھے رہائی چاہئے مجھے انتظار ہے ایک ایسی قوت کا جو رات کی ظلمت کو پھاڑ کر صبح کی روشنی نمودار کردے۔

ooo

مشاہیر کی آرا

❁ احمد رشید کی عورت حیات و کائنات کے اس بے ہنگم شور اور ناہموار نظام پر سوال در سوال قائم کرتی ہے تو سماجیات کی ایک نئی تصویر بھی ابھرتی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک نیا تخلیقی و جمالیاتی تصور بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جو گذشتہ تصورِ فکر و فن کو نہ صرف توڑتا ہے بلکہ ایک نئے تصور کو جنم بھی دیتا ہے لیکن ہمارے نقادانِ ادب تخلیق کی ان صورتوں سے بے خبر مدرسہ کی قیل و قال اور تھیوری کی اُلجھی ہوئی بحثوں میں قید ہیں جسے صرف فرار کی صورت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب ہر ایک راست تخلیق پر باتیں ہوں۔ ان کی تخلیقات کی جن میں آج کا انسان زندہ ہے۔ اور آج کا ہندوستان ارواب تو عالمی جنگ و جدل کی بھی بت کرنی ضروری ہے کہ خون عراق میں بہے یا گجرات میں خون انسان کا ہی بہتا ہے اگر انسان اپنی عزت و حرمت کے ساتھ زندہ ہے تو کہانیاں بھی زندہ رہیں گی حضرت انسان کی سلامتی و بہبودی ہمارا اولین فرض ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

❁ احمد رشید کے افسانے ''وہ اور پرندہ''، ''برف تلے''، ''بن باس کے بعد''، ''صدیوں پر پھیلی کہانی'' اور ''سراب'' میں تخلیق کائنات کے آرکی ٹائپ اور اس سے متعلق اساطیری کرداروں اور روایتی عقائد و توہمات کی معنویت عصری تناظر میں واضح کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی یہ کہانیاں مابعد جدید تصور ادب ''بین المتونیت'' سے تخلیقی سطح پر استفادہ کی خبر دیتی ہیں۔ افزونی حیات کے باوجود قوت تخلیق سے محرومی آج کے انسان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ زندگی کرنے کے مخصوص

ڈھب پر اصرار اور آزادیٔ عمل کی ازلی انسانی خواہش پر معاشرتی اور مذہبی تجدید انسان کو تقلید کی سعی رائگاں پر کیسے مجبور کرتی ہے، احمد رشید کا افسانہ ''سراب'' اس اجمال کی تفصیل پر دال ہے۔ تخلیق کے مختلف مظاہر اور امکانات اپنی معنویت سے کیوں عاری ہو گئے ہیں، اس استفسار کا جواب سماجی سروکاروں میں مضمر ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی

❁ احمد رشید نے اپنے افسانوں کو ماورائی تصورات، تہذیب و ثقافت کی ابتداء اور ارتقا کو عوامی مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف ماورائیت، مذہبی اور اساطیری فضا دوسری طرف زمینی مسائل سے ارتباط فنّی چابکدستی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے افسانے روایتی افسانے کی طرح صرف کہانی بیان نہیں کرتے۔ زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست اور جبریت و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ ''مداری'' میں فسطائی طاقتوں نے جو سیاسی ڈھونگ رچایا ہے اس کو تمثیلی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم

❁ احمد رشید (علیگ) اظہار بیاں کی بھی مہارت رکھتے ہیں پھر بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی ان کی زبان و طرز بیان میں ایک قسم کی بے ربطی کا احساس ہوتا ہے لیکن یہی بے ربطی جب ذہن کی پرتوں کو کھولنے میں مددگار بن جاتی ہے تو کمزوری بھی حسن بن جاتی ہے۔ ان کا اسلوب بھی قدرے غیر مانوس اور کبھی کبھی اجنبی سا لگتا ہے مگر یہی غیر مانوسیت اور اجنبیت جب ان کے افسانوں کی پرت در پرت معنویت سے نئے ذائقوں کا احساس دلاتی ہے تو احمد رشید کے تخلیقی وفور و شعور اور ان کے فکر خیز تخلیقی رویے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی

❁ افسانے کی ناپ تول کرنا افسانوی تنقید کا وطیرہ ہے جبکہ غیر متعین پیمائش کی گردان زبان زد رہتی ہے کہ ہر اہم افسانہ اپنے تخلیقی پیمانے لے کر نازل ہوتا ہے لیکن عموماً نقد و نظر کا طریقہ کار وہی روایتی (Traditional) ہے۔ یہاں یہ اصرار بے معنی ہو جاتا ہے کہ افسانہ کی پرکھ کے لیے افسانہ نگار کے موضوعِ زندگی کے ساتھ رویہ (treatment) کی بنیاد پر وہ منفرد اور ممتاز ہوتا ہے۔ افسانہ کو صرف کہانی سمجھ کر پڑھنے کے عمل میں کہانی پن ہونے کی بنیاد پر افسانہ تو ہو جائے گا لیکن تخلیق کار جس طرح ہمیں زندگی کی آگہی اور باریک بینی سے روشناس کرانا چاہتا ہے، وہاں تک رسائی مشکل ترین مرحلہ ہے۔ قارئین افسانہ کو جس طرح پڑھنے کے عادی ہیں، اس سے مختلف انداز میں احمد رشید کے افسانے پڑھے جانے کا تقاضہ کرتے ہیں۔

روایتی انداز میں مطالعہ کرنے والوں کو شاید احمد رشید کے افسانوں میں کشش محسوس نہیں ہو، مگر افسانہ کے سنجیدہ قارئین کے لیے ان کے افسانے دلچسپی کا مرکز بنے رہیں گے!

ڈاکٹر سیما صغیر

❁ احمد رشید کی بیش تر کہانیاں (Multi Dimensional) ہیں جن میں زندگی کے مختلف (Shades) نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''ویٹنگ روم'' میں پینٹنگ کے ذریعے کائنات کے نظامِ حکومت کی تاریخ اور انسان کے تہذیبی ارتقا کی داستان ملتی ہے۔ ''بائیں پہلو کی پسلی'' میں تمدنی ارتقا کا بہت ہی خوب صورت بیانیہ ملتا ہے۔ ''کہانی بن گئی'' میں ایک بدصورت عورت جو نگاہ غلط انداز سے بھی محروم ہے، کی نفسیاتی الجھن کو بڑی فن کاری سے پیش کیا گیا ہے جو اپنے احساسِ کم تری کو ختم کرنے کے لیے اپنے قد کو اونچا کرنے اور اپنی پہچان بنانے

کے لیے ملک کی بڑی ناول نگار بنتی ہے۔عورت کی ذہنی کیفیت، جنسی الجھن اور نفسیاتی کش مکش کو اس طرح پیش کرنا کہ اسٹوری لائن اختتام تک قائم رہے، فن کارانہ چابک دستی کی غماز ہے۔احمد رشید عصری مسائل کو کائنات کے قدیم آرکی ٹائپ سے جوڑ کر ماورائی جہتوں کو اساطیری کرداروں اور روایتی عقاید وتوہمات کی معنویت عصری تناظر میں واضح کرنے کا عمل ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔

حسام الدین (علیگ)

❁ احمد رشید کے افسانوں کا بنیادی وصف اُن کا انداز بیان ہے جو انھیں معاصر فنکاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ان کے افسانوں میں عورت اپنے عورت پن کے ساتھ موجود ہے اور جہاں وہ عورت اس تمیز کو دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش کرتی ہے وہاں وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہے۔افسانوی نظام کے ساتھ انھیں فنی ہنرمندی پر عبور حاصل ہے۔ساتھ ہی یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانوں کے اکثر کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبدالباسط

❁❁❁

مصنف کی دیگر کتابیں

(1) وہ اور پرندہ (افسانے) 2002ء

(2) بائیں پہلو کی پسلی (افسانے) 2012ء

(3) کھوکھلی لگر (افسانے) 2018ء

KHOKHLI KAGAR

by

Ahmad Rasheed (Alig)

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi . INDIA

ISBN 978-93-89002-00-3

978-93-89002-00-3

www.ephbooks.com